ستمبر ۱۹۹۰ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
قرآن مجید کی سورتوں کے نام (نشری تقریر)	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
ہدایت القرآن (۴۲)	مولانا محمد تقی امینی	۶
امام بیہقیؒ (کاروانِ حدیث، ۹)	عبدالرشید عراقی	۱۳
ہمارے تعلق بالقرآن کے چند غور طلب گوشے	علامہ غلام شبیر بخاری	۱۷
منشورِ اسلام (۱۵)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۲۹
حکمتِ اقبال	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۷
لغات و اعرابِ قرآن	پروفیسر حافظ احمد یار	۴۳
رسیدِ کتب	ادارہ	۶۳

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

سانحۂ کربلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

شہیدِ مظلوم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب اور آپ کی مظلومانہ شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہدِ صدیقی رضؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا، آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانی ابولؤلؤ فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں
- علی مرتضیٰ رضؓ کی طرح حضرت حسین رضؓ بھی قاتلینِ عثمان رضؓ کی سازش کا شکار ہوئے
- سیّد الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لیے

امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

کا مطالعہ کیجیے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
صرف ۱۱/- روپے (سستا ایڈیشن ۶/- روپے)

قریبی بک سٹال سے طلب کیجیے یا ہم سے منگوائیے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ: ٢٦٩)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ احمد یار، پروفیسر حافظ محمد فاضل، حافظ خالد محمود خضر

جلد ٩ — ستمبر ١٩٩٠ء - صفر المظفر ١٤١١ھ — شمارہ ٩

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

٣٦-کے. ماڈل ٹاؤن. لاہور فون: ٨٥٦٠٠٣

کراچی آفس: ١١ داؤد منزل متصل شاہ بکری. شاہراہ لیاقت کراچی فون: ٢١٦٥٨٦

سالانہ زرتعاون -/٤٠ روپے فی شمارہ -/٤ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

زیرِ نظر شمارے میں علامہ سیّد غلام شبیر بخاری کا ایک وقیع مقالہ شامل ہے۔ یہ مقالہ علامہ صاحب نے اسی سال مارچ میں منعقدہ سالانہ محاضراتِ قرآنی میں پیش فرمایا تھا۔ ان محاضرات کا عنوان جیسا کہ قارئین کے علم میں ہے، 'دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر' متعین ہُوا تھا اور تمام مقالہ نگار حضرات نے اسی موضوع کے مختلف گوشوں پر تحریری شکل میں اظہارِ خیال فرمایا تھا۔ علامہ صاحب کے مقالے کا عنوان تھا: 'ہمارے تعلق بالقرآن کے چند گوشے'۔ فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تصنیف 'مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' کو جسے بجا طور پر دعوت رجوع الی القرآن کے اس کام کے مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے، بنیاد بناتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب کے معیّن کردہ پانچ حقوق کے حوالے سے ہمارے موجودہ معاشرے کا ایک محققانہ جائزہ پیش فرمایا ہے اور جس جس پہلو سے کمی یا کوتاہی کا انہیں مشاہدہ ہوا، مقالے میں اس کی نشاندہی فرمائی ہے بلکہ اصلاحِ احوال کے ضمن میں بعض مفید تجاویز بھی پیش فرمائی ہیں۔ بطور یاد دہانی عرض ہے کہ وہ پانچ حقوق حسب ذیل ہیں: ۱) ایمان بالعظیم، ۲) تلاوت و ترتیل، ۳) تذکّر و تدبّر ۴) حکم و اقامت اور ۵) تبلیغ و تبیین۔

اس حوالے سے ذہن منتقل ہوا کہ آج سے قریباً ۱۰ سال قبل سیّد نذیر نیازی مرحوم نے مرکزی انجمن کے زیرِ اہتمام سالانہ قرآن کانفرنس کی ایک نشست میں علامہ اقبال اور قرآن حکیم کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اس مقالے میں سیّد صاحب نے انہی پانچ حقوق کے حوالے سے علامہ اقبال کی زندگی کا ایک بڑا مؤثر جائزہ پیش فرمایا تھا کہ حضرت علامہ کی قرآن حکیم کے ساتھ جو گہری ذہنی و فکری وابستگی تھی اس کا اظہار ان پانچ حقوق کے حوالے سے کس طور پر ان کی زندگی میں سامنے آتا ہے! ۔۔۔ سیّد صاحب کا یہ مقالہ کچھ عرصہ قبل 'حکمتِ قرآن' کے صفحات کی زینت بن چکا ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ تاریخی اہمیت کے حامل اس مقالے کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تالیف 'علامہ اقبال اور ہم' کے آئندہ ایڈیشن میں شامل کر دیا جائے گا تاکہ یہ گرانقدر مقالہ ایک مستقل کتاب کا حصّہ بن کر تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو جائے!

نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن مجید کی سورتوں کے نام

اَحْمَدُہٗ وَاُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ۝ اَمَّا بَعْدُ ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ ــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قرآن مجید کُل ایک سَو چودہ سورتوں پر مشتمل ہے اور ہر سورت آیات پر مشتمل ہے، جن کی تعداد میں بڑا فرق و تفاوت پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سب سے چھوٹی سورتیں وہ ہیں جو تین تین آیات پر مشتمل ہیں اور حُسنِ اتفاق سے اُن کی تعداد بھی تین ہی ہے یعنی سورۃ العصر، سورۃ الکوثر اور سورۃ النصر۔ جب کہ تعدادِ آیات کے اعتبار سے مکّی سورتوں میں سب سے بڑی سورت سورۃ الشعراء ہے، جس میں دو سو ستائیس (۲۲۷) آیات ہیں اور مدنی سورتوں میں سب سے بڑی سورت سورۃ البقرۃ ہے جس میں دو سو چھیاسی (۲۸۶) آیات ہیں۔

آیت کہتے ہیں نشانی اور دلیل کو، اور اس میں اشارہ ہے اس حقیقت کی جانب کہ قرآن مجید کی ہر آیت اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل اور حکمتِ کاملہ کی بیّن دلیل اور روشن نشانی ہے۔ جبکہ سورت کا لفظ سُور سے بنا ہے جس کے معنی ہیں فصیل یا شہر پناہ۔ اور اس میں رہنمائی ہے اس حقیقت کی طرف کہ قرآن حکیم کی ہر سورت گویا علم و حکمت کا ایک شہر ہے جس کے گرد اگرد فصیل کھنچی ہوئی ہے۔ اور اس طرح پُورا قرآن گویا خالقِ ارض و سما اور مالک الملک کے علم و حکمت کا ایک وسیع و عریض ملک ہے جس میں بڑے بڑے شہر بھی آباد ہیں اور چھوٹی چھوٹی آبادیاں بھی! ــــ واضح رہے کہ قرآن حکیم کی ان سورتوں کو عام انسانی تصانیف پر قیاس کرتے ہوئے ابواب، فصول یا Chapters سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ دراصل ان میں سے ہر سورت ایک مکمّل کتاب کا درجہ رکھتی ہے، اور ان میں علوم و معارف اور معانی و مفاہیم کا پُورا پُورا شہر آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نام بھی (الّا ماشاء اللہ)

مضامین کی مناسبت سے نہیں ہیں بلکہ محض علامت کے طور پر ہیں، جیسے کہ اسمائے عَلَم ہوتے ہیں جن میں بالعموم معانی کا لحاظ نہیں ہوتا۔ گویا "البقرۃ" محض بطورِ علامت نام رکھ دیا گیا ہے اُس سورت کا جس میں ذبحِ بقرہ کے متعلق تاریخ بنی اسرائیل کا ایک اہم واقعہ مذکور ہے۔ اور "آلِ عمران" نام دیا گیا ہے اُس سورت کو جس میں 'آلِ عمران' کا ذکر آیا ہے وَقِسْ عَلٰی ذٰلِکَ۔

علامت کے تعیّن کے ضمن میں سب سے آسان اور سہل صُورت یہ رہی ہے کہ جن سورتوں کا آغاز حروفِ مقطّعات سے ہوا ہے، ان میں سے جن کے آغاز میں ایک ایک حرف آیا ہے، ان کے نام انہی پر رکھ دیئے گئے ہیں۔ اور حُسنِ اتفاق سے ایسی سورتیں بھی تین ہی ہیں یعنی سورۂ صٓ، سورۂ قٓ اور سورۂ نٓ ـــــ اس طرح جن سورتوں کے آغاز میں دو دو حروفِ مقطّعات آتے ہیں ان میں سے بھی دو ان ہی سے موسوم ہیں یعنی سورۂ یٰسٓ اور سورۂ طٰہٰ ـــــ یہ سہولت ظاہر ہے کہ ان سورتوں کے ناموں کے ضمن میں کام نہیں آسکتی جن میں ایک ہی جیسے حروفِ مقطّعات آتے ہیں، جیسے "حٰمٓ" اور "الٓمٓ" سے چھ چھ سورتوں کا آغاز ہوا ہے، لہٰذا اُن کے نام ان حروفِ مقطّعات پر نہیں رکھے جاسکتے ـــــ اگرچہ حٰمٓ اور الٓمٓ سے شروع ہونے والی سورتوں میں سے ایک ایک میں آیتِ سجدہ موجود ہے، لہٰذا ان کے نام "حٰمٓ السّجدۃ" ـــــ اور "الٓمٓ السّجدۃ" یا صرف سورۃ السّجدۃ رکھ دیئے گئے۔ اسی طرح جن سورتوں کے آغاز میں چار یا پانچ پانچ حروفِ مقطّعات آتے ہیں ان کو بھی اگر ان ہی سے موسوم کیا جاتا تو ان کے نام طویل بھی ہو جاتے اور ثقیل بھی، لہٰذا ان کو دوسرے ناموں سے موسوم کر دیا گیا۔ اس طرح قرآن مجید کی اُن اُنّیس سورتوں میں سے بھی جو حروفِ مقطّعات سے شروع ہوتی ہیں، صرف چھ یا سات کو ان سے موسوم کیا جاسکا۔

باقی سورتوں کی عظیم اکثریت کا معاملہ وہی ہے جو پہلے عرض کیا جا چکا ہے یعنی یہ کہ ہر سورت میں سے کوئی ایک لفظ بطورِ علامت لے لیا گیا اور وہی اس سورت کا نام قرار پایا۔ اس ضمن میں بھی اکثر و بیشتر سورت کے پہلے ہی لفظ کو اس کا نام قرار دے دیا گیا ہے یا پہلی آیت سے نام اخذ کر لیا گیا ہے۔ سورۃ الصّٰفّٰت، سورۃ الذاریات، سورۃ الطور، سورۃ النجم، سورۃ الرّحمٰن، سورۃ الحاقّۃ، سورۃ المرسلات، سورۃ النازعات، سورۂ عبس، سورۃ الفجر، سورۃ الشمس، سورۃ اللّیل، سورۃ الضحیٰ، سورۃ

التّین، سورۃ العادیات، سورۃ القارعہ، سورۃ العصر، مقدّم الذکر قسم کی اہم مثالیں ہیں اور سورۃ المومنون، سورۃ الفرقان، سورۃ القمر، سورۃ الواقعہ، سورۃ المجادلہ، سورۃ المنافقون، سورۃ الطّلاق، سورۃ التحریم، سورۃ الملک، سورۃ المعارج، سورۃ نوح، سورۃ التکویر، سورۃ الانفطار، سورۃ المطفّفین، سورۃ البروج اور سورۃ الطارق وغیرہ مؤخّر الذکر کی نمایاں مثالیں ہیں۔

بقیہ سورتوں میں سے اکثر کے نام سورت کے کسی بھی حصّے میں وارد شدہ آیت کے کسی لفظ سے ماخوذ ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ کیفیت سورۃ الفاتحہ کے سوا قرآن کے نصفِ اوّل یعنی پہلے پندرہ پاروں میں وارد شدہ تمام سورتوں میں پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں میں صفاتی نام ـــــ یعنی ایسے نام جو اُن کے مضامین یا خواص پر دلالت کریں، بہت کم ہیں۔ بہرحال ان میں ایک سب سے زیادہ شاندار مثال تو ہے سورۃ الفاتحہ کی جس سے قرآن کا آغاز ہوتا ہے، اور الفاتحہ کے معنی ہیں "کھولنے والی" یعنی قرآن کی افتتاحی سورت یا Opening Surah of the Quran اس سورۃ مبارکہ کے اور بھی بہت سے نام ہیں اور وہ سب کے سب صفاتی ہیں اور اس کی عظمت و جامعیّت کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔ جیسے اُمّ القرآن، اساس القرآن، الکافیہ، الشّافیہ وغیرہ۔ ایسی ہی ایک دوسری مثال قرآنِ حکیم کی آخری سورتوں میں بھی ہے یعنی سورۃ الاخلاص، جو توحیدِ خالص کا ایک عظیم خزانہ ہے اور اللہ کے لیے بندے کے خلوص و اخلاص کی کامل ضمانت! ـــــ اسی طرح قرآنِ حکیم کی سورتوں کے جوڑوں کو بھی صفاتی نام دیئے گئے ہیں جیسے بالکل آغاز میں "الزّہراوین" کے نام سے موسوم کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ البقرۃ اور سورۃ آلِ عمران کو، یعنی دو انتہائی روشن اور تابناک سورتیں۔ اور اسی اصول پر قرآن کی آخری دو سورتوں کو موسوم کیا گیا "المعوّذتین" کے نام سے، اس لیے کہ ان دونوں میں تعوّذ کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کی ایک اور مثال ہے "المسبّحات" کا نام جو ان سورتوں کو دیا گیا جن کے آغاز میں تسبیح باری تعالیٰ کا ذکر ہے جیسے سورۃ الحدید، سورۃ الحشر، سورۃ الصّف، سورۃ الجمعہ اور سورۃ التغابن ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی کتابِ حکیم سے ذہنی مناسبت اور قلبی محبّت عطا فرمائے، اور اس کے علم اور عمل دونوں سے بھرپور طور پر بہرہ اندوز ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

سورۃ البقرہ آیات ۲۲۸ تا ۲۳۲

طلاق و خلع کے احکام

دو دلوں کا جڑنا جس طرح اللہ کو پسندیدہ ہے اسی طرح دونوں کا ٹوٹنا اللہ کو ناپسندیدہ ہے۔ جس رشتہ (نکاح) سے یہ دونوں جوڑے جائیں وہ اللہ کو محبوب ہے اور جس سے (طلاق) یہ توڑے جائیں وہ اللہ کو مبغوض ہے۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مباحات میں سب سے زیادہ مبغوض (ناپسندیدہ) طلاق کو قرار دیا ہے۔ پھر بھی زندگی میں ایسی ناگواریاں پیش آتی ہیں کہ یہ کڑوا گھونٹ پیے بغیر چارہ نہیں رہتا ہے۔ ایسی حالت میں طلاق کی اجازت ہے، عام حالت میں نہیں ہے

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ

بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ
مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا
اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ
عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۲۲۸ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠
فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ
اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـــًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ
وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۲۲۹ فَاِنْ
طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ فَاِنْ
طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا

حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾
وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ
اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۠ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ
اللّٰهِ هُزُوًا ۠ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ
مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ
اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا
تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ
يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۗ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

" اور طلاق دی ہوئی عورتیں تین ماہواری (یا تین ماہ) تک اپنے آپ کو نکاح کرنے سے روکے رکھیں۔ اور ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ جو اللہ نے ان کے پیٹوں میں پیدا کیا ہے (حمل) اس کو چھپائیں، اگر وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند اگر وہ ٹھیک طرح اصلاح (نباہ) کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ اس مدّت میں ان کو لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں۔ عورتوں کے لیے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں، البتہ (گھریلو انتظام کے لحاظ سے) عورتوں پر مردوں کو ایک قسم کی فضیلت حاصل ہے (جو خود بخود ابھر آتی ہے)۔ اور اللہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔ طلاق دو مرتبہ ہے، پھر ٹھیک طرح سے روک لینا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور تمہارے لیے اس میں سے (طلاق کے بعد) کچھ بھی واپس لینا جائز نہیں ہے جو تم نے انہیں دیا ہے، مگر یہ کہ دونوں ڈریں کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے۔ تو اگر خوف ہو کہ دونوں اللہ کی حدیں نہ قائم رکھ سکیں گے تو ان

دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ عورت معاوضہ (اس میں سے جو شوہر نے دیا ہے) دے کر پیچھا چھڑا لے (خلع لے لے)۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ جاؤ۔ جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کریں گے وہی ظالم ہیں۔ پھر اگر اس کو (تیسری بار) طلاق دے دی تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند (شخص) سے نکاح کرے۔ پھر اگر وہ اسے خود بخود طلاق دے دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ آپس میں رجوع کریں (نکاح کریں)، اگر ان کا گمان غالب ہو کہ وہ اللہ کی حدیں قائم رکھ سکیں گے۔ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جن کو وہ کھول کر بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں[۲]۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو، پھر وہ اپنی عدّت کو پہونچ جائیں تو انہیں ٹھیک طرح روک لو یا ٹھیک طرح چھوڑ دو۔ اور انہیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکو کہ تم ان پر سختی کرو۔ اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا اور اللہ کے احکام کا مذاق نہ اڑاؤ اور اللہ کے جو احسان تم پر ہیں ان کو یاد کرو۔ اور خاص طور سے اس احسان کو جو اس نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے تاکہ تمہیں اس کے ذریعے نصیحت کرے۔ اور یاد رکھو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدّت کو پہونچ جائیں تو اب انہی (پہلے) خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو، جبکہ وہ آپس میں قاعدہ (ہنسی خوشی) کے مطابق راضی ہو جائیں۔ تم میں یہ نصیحت اس کو کی جاتی ہے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ تمہارے لیے بڑی صفائی اور بڑی پاکیزگی کی بات ہے۔ اور اللہ ہی جانتا ہے، تم نہیں جانتے ہو[۳]۔

---

[۲] اللہ کی ہدایت نے ہمیشہ عورتوں کے ساتھ انصاف کیا ہے اور نفس و شیطان کی ماری دنیا نے ہمیشہ اس کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ کتنے حقوق مرد کو دیئے گئے اور کتنے عورتوں کو دیئے

گئے، اب یہ بحث ختم ہونی چاہیئے۔ بحث اس پر ہونی چاہیئے کہ دونوں کو جس قدر بھی حقوق دیئے گئے ہیں ان پر عمل درآمد کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ کاغذ پر حقوق دے دینے اور قانون بیان کر دینے سے کچھ نہیں ہوتا ہے، جب تک اس پر عمل درآمد کی مضبوط راہیں نہ نکالی جائیں۔ آج عورتوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں کیا کوئی مذہبی یا غیر مذہبی قانون اس کی اجازت دیتا ہے؟ اور کس سوسائٹی یا سماج نے مردوں اور عورتوں کو یہ حق دیا ہے کہ زندگی میں دونوں ایسی روش اختیار کریں جس سے ایک دوسرے کی زندگی تنگ ہو جائے اور بالآخر خودکشی و خودسوزی تک نوبت آ جائے؟

اصل مسئلہ حقوق و قانون کے دینے اور لینے کا نہیں ہے، بلکہ اخلاق و کردار کا ہے جس سے دنیا دیوالیہ ہو چکی ہے اور جس پر قابو پانے کے لیے اس کے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے۔

اللہ کی ہدایت صرف حقوق و قانون نہیں دیتی ہے، بلکہ اس سے زیادہ اخلاق و کردار پر زور دیتی ہے۔ جس سے دنیا کو یہ سبق ملتا ہے کہ حقوق کتنے ہی زیادہ دے دیئے جائیں، قانون کتنا ہی اچھا بنا دیا جائے، جب تک اخلاق و کردار پر قابو نہ پایا جائے سب بے معنیٰ ہیں۔ دنیا نے اللہ کی ہدایت چھوڑ کر ہزار تدبیریں کر لیں، لیکن اس کو راستہ نہ مل سکا۔ اب اگر وہ سوسائٹی کے مسائل حل کرنا چاہتی اور عورت و مرد دونوں کو انصاف دینا چاہتی ہے تو "ہدایت" کی طرف آنے کی بات سوچنی چاہیئے۔ اللہ کا خوف اور اس کے سامنے جواب دہ ہونا ایسی تدبیر ہے کہ اس کے مقابلہ میں ساری تدبیریں بیکار ہیں۔ اور یہ اللہ کی ہدایت کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی ہے۔ لیکن اس پر سچا ایمان لانا ضروری ہے جو دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور عمل کے لیے مجبور کر دے۔ بدقسمتی سے مسلم سوسائٹی ہی سچے ایمان اور اللہ کے سامنے جوابدہ ہونے کو دل کی گہرائیوں میں اتارنے سے محروم ہے جس کی بنا پر اس کے یہاں بھی مسائل ہیں اور حقوق و قانون کی بحث جاری ہے۔

اُوپر کی آیتوں میں کئی بار حدود (قاعدہ قانون) سے تجاوز نہ کرنے کا ذکر ہے اور آخر کی آیت میں ہے کہ "یہ سب اُس کے لیے ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے" جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک ایمان نہ ہو اللہ کا خوف نہ ہو قاعدہ قانون پر عمل درآمد نہ ہو سکے گا۔

عورت کے حقوق و فرائض کا ذکر راقم الحروف کی کتاب "تہذیب کی تشکیلِ جدید" میں ہے۔ جس کا جی چاہے وہاں دیکھ لے۔ اس کا عربی و انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۲؎ طلاقِ رجعی اس کو کہتے ہیں جس میں نکاح کے بغیر رجوع کرنے کا حق رہتا ہے۔ آیت میں اسی کا ذکر ہے۔ یہ حق دو طلاق تک رہتا ہے۔ تیسری طلاق کے بعد یہ حق ختم ہو جاتا ہے۔ طلاق کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ مہینہ میں صرف ایک طلاق دی جائے، دوسرے مہینہ میں دوسری طلاق دی جائے، پھر تیسرے مہینہ میں تیسری طلاق دی جائے، اس طریقہ سے رجوع کرنے کے لیے سوچنے سمجھنے کا موقع ملے گا اور زندگی و خاندان تباہ و برباد ہونے سے بچ جائے گا۔ ایک ہی وقت میں تین طلاق دینے کا طریقہ نہایت غلط ہے۔ اس پر پابندی لگانے کی ضرورت ہے یا کم سے کم اتنا تو ہونا ہی چاہیئے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک شمار کیا جائے تاکہ اس کے ساتھ دوسری مرتبہ نکاح کرنے میں دشواری نہ ہو، جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کی رائے ہے۔

نکاح کے وقت جو مال و اسباب دیا ہے اب طلاق کے وقت اس کا واپس لینا جائز نہیں ہے (عام طور سے لوگ واپس لے لیتے ہیں جو سراسر گناہ ہے)۔ ہاں واپس لینے کی ایک شکل نکل سکتی ہے کہ عورت خود کہے کہ میں تمہارا دیا ہوا کل مال یا کچھ مال واپس کر دوں گی، تم میری جان چھوڑ دو (علیحدہ کر دو)۔ تو ایسی صورت میں دیا ہوا مال واپس لینے کی اجازت ہے۔

۳؎ طلاقِ رجعی کے بعد رجوع کرنے کا حق ہنسی خوشی نباہ کے لیے ہے، بدلہ لینے یا تکلیف پہونچانے کے لیے نہیں ہے۔ اگر عورت کو یقین ہو کہ شوہر تکلیف پہنچائے گا یا بدلہ لے گا تو اس کو رجوع نہ ہونے کا حق حاصل ہے۔ ایسی صورت میں دونوں کے درمیان اختلاف ہوگا۔ ایک کچھ کہے گا دوسرا اس کے خلاف کہے گا۔ اگر آپس میں یہ معاملہ دوسروں کی مدد سے طے نہیں ہوتا ہے تو عدالت طے کرے گی۔ رجوع کرنے کا یہ حکم پہلے بھی آیا ہے لیکن یہاں مستقل طور سے ہے اور پہلے دوسری چیزوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے تکرار نہیں کہہ سکتے ہیں، اس طرزِ بیان سے حکم کی اہمیت ظاہر ہوتی اور اللہ کی پسندیدگی کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح طلاق سے جدائی کے بعد عورت ہنسی خوشی آپس کی رضامندی سے پھر اپنے پہلے شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو اس کو کوئی نہ روکے۔ اس کو پورا حق اور پورا اختیار ہے۔

دُودھ پلانے کے احکام

شوہر و بیوی میں جُدائی کے بعد دودھ پینے والے بچّے کا مسئلہ سامنے آتا ہے کہ اس کو "ماں" دودھ پلائے یا باپ علیحدہ سے انتظام کرے۔ سبھی ڈاکٹروں اور طبیبوں کا اتفاق ہے کہ ماں کے دودھ میں بچّہ کے لیے جس قدر فائدے ہیں وہ کسی اور کے دودھ میں نہیں ہیں۔ پھر ماں کی ممتا بچّہ کو جو کچھ دیتی ہے دنیا کی کوئی چیز اس کا بدل نہیں ہو سکتی ہے۔ جُدائی کے بعد بچہ کو ماں کے دودھ اور اس کی ممتا سے محروم کر دینا کسی طرح قرین انصاف نہیں ہے۔ آگے کی آیتوں میں دودھ پلانے ہی سے متعلق حکم و احکام ہیں۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ

اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ
الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ
بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ
ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

"اور مائیں پورے دو سال اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔ یہ حکم اس کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدّت پوری کرنا چاہے۔ اور باپ پر دودھ پلانے والیوں کا کھانا کپڑا ہے جو کچھ طے ہو جائے۔ کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے، نہ ماں کو اس کے بچّہ کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے تکلیف دی جائے۔ اگر باپ نہ ہو تو اس کے وارث کے ذمہ کھانا

پکڑا ہے جیسے باپ کے ذمہ تھا[1] پھر اگر دونوں اپنی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں (کم مدّت میں) تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر تم ماں کے علاوہ کسی اور سے اپنی اولاد کو دودھ پلانا چاہو تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ ماں کو وہ ادا کر دو جو اس کو دینا طے کیا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے[2]۔

---

[1] دودھ پلانے کی اصلی حقدار بچّہ کی ماں ہے۔ اگر کوئی مجبوری ہو یا دودھ میں خرابی ہو تو دوسری عورت پلائے۔ اس مدّت میں دودھ پلانے والی کے اخراجات باپ کے ذمہ ہیں، چاہے بچہ کی ماں دودھ پلائے یا دوسری عورت پلائے۔ اخراجات لینے اور دینے میں کسی پر زیادتی نہ ہونی چاہیئے۔ جو کچھ آپس میں طے ہو جائے یا جو مقدار دینے کا رواج ہو اسی کی دونوں کو پابندی کرنی چاہیئے۔ باپ کے نہ ہونے کی صورت میں اخراجات کی ذمہ داری والدین پر ہے۔

[2] دودھ پلانے کی پوری مدّت دو سال ہے۔ آپس کی رضامندی سے اگر درمیان میں چھڑانا چاہیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح ماں کے علاوہ دوسری عورت سے پلانا چاہے تو ماں کو جو کچھ دینا طے ہو جائے اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی دوسری عورت سے دودھ پلانے کی اجازت ہے۔

بقیہ: 'حکمتِ اقبال'

نظریاتی جماعتوں کی مزاحمت کے بغیر آزادی سے نوعِ انسانی کے ارتقاء کو جاری رکھ سکے اور ان کو حسن و کمال کی انتہا تک پہنچا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر نبی کا نظریۂ حیات یا قانونِ شریعت وہی ہوتا ہے جو لوگوں کو اس کی اپنی عملی زندگی کی مثال میں پوری طرح سے سمویا ہوا نظر آئے۔ جو کام ایک نبی اپنی عملی زندگی میں خود نہ کر سکا ہو وہ اس کے ماننے والے فقط اس کی زبانی نصیحت کی بنا پر کر لینے کا داعیہ نہیں پاتے اور وہ کام بجا طور پر اس کی تعلیمات سے عملاً خارج سمجھ لیا جاتا ہے۔

عبدالرشید عراقی

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقیؒ

بسلسلہ محدثین کرام کی علمی خدمات

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی خراسان کے شہر بیہق میں ۳۸۴ھ میں پیدا ہوئے[۱]۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے علمائے کرام سے حاصل کی۔ بعدازاں تحصیلِ علم کے لیے عراق اور حجاز کے اہم شہروں بغداد، کوفہ اور مکہ معظمہ کا سفر کیا، اور ہر جگہ وہاں کے اساطینِ فن سے استفادہ کیا[۲]۔

امام ابوبکر بیہقی کے حفظ، ضبط، عدالت و ثقاہت اور اتقان پر ائمہ فن کا اتفاق ہے۔ اربابِ سیر نے ان کو ثقہ اور قابلِ اعتماد لکھا ہے۔ اور 'الحافظ الکبیر' کے لقب سے موسوم کیا ہے[۳]۔ حفظ و ضبط کی طرح معرفتِ حدیث میں عدیم المثال تھے۔ احادیث کے علل و اسقام کی تمیز میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ حدیث اور اس کے متعلقات میں اس درجہ عبور ہونے کی بنا پر ان کا شمار نامور محدثین میں ہوتا ہے — علامہ ابنِ عساکر (م ۵۷۱ھ) نے ان کو شیخ السنۃ اور علامہ ابن العماد الحنبلی (م ۱۰۸۹ھ) نے ان کو شیخِ خراسان کے لقب سے یاد کیا ہے[۴]۔

امام بیہقی کی شہرت و مقبولیت ان کے حدیث میں مہارت تامہ کی وجہ سے ہوئی۔ مؤرخ ابنِ خلکان (م ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں:

غلب علیہ علم الحدیث و اشتھر بہ[۵]

"ان پر علمِ حدیث خاص طور سے غالب تھا۔ اور اس میں انہیں نمایاں شہرت حاصل ہوئی۔"

حدیث کے علاوہ فقہ اور اصول فقہ میں بھی امام بیہقی مہارت تامہ رکھتے

تھے اور اس میں ان کو مکمل عبور حاصل تھا۔ علامہ ابن عساکر (م ۵۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی نے اپنی کتابوں میں علم حدیث و فقہ دونوں کے مسائل و معلومات جمع کیے ہیں۔ اسی کے ساتھ علل حدیث، صحیح و سقیم روایات کی نشاندہی، احادیث کے درمیان جمع و تطبیق کے وجوہ اور فقہ و اصول وغیرہ مختلف النوع مباحث بیان کیے ہیں۔"[۶]

علامہ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"امام بیہقی علوم و فنون میں اپنے زمانہ اور اپنے معاصرین میں یکتا اور بے نظیر تھے۔"[۷]

امام بیہقی کی فنی مباحث میں غیر معمولی تحقیق و تدقیق کا اعتراف کیا گیا ہے۔ محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں:

تحقیقات در علوم بسیار دارد و در مباحثہ و مناظرہ غایت انصاف مرعی میداشت[۸]

(علوم میں بڑی تحقیق سے کام لیتے تھے اور مباحثہ و مناظرہ میں انصاف کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔)

امام بیہقی شافعی المذہب تھے۔ ان کو اس مذہب سے غیر معمولی شغف تھا اور اس مذہب کی نشر و اشاعت میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کی ذات سے شافعی مذہب کو بڑا فائدہ پہنچا۔ علامہ ابن سبکی (م ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں:

"کوئی شافعی المذہب ان کی تصنیفات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا"[۹]

حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت اور اتقان کی طرح زہد و ورع اور عفت و قناعت بھی ان کی سیرت کا اہم جوہر تھے۔ علامہ ابن عساکر (م ۵۷۱ھ) لکھتے ہیں:

کان البیہقی علی سیرۃ العلماء قانعاً من الدنیا بالیسیر متحملاً فی زہدہ و ورعہ و لقی کذا لک

الی ان توفی[۱۰]

(امام بیہقی علمائے سلف کی طرح غیر معمولی اور تھوڑی چیز پر قانع اور زہد و ورع میں ممتاز تھے۔ وفات تک ان کا یہی حال تھا۔)

امام بیہقی نے ۷۴ سال کی عمر میں شنبہ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۴۵۸ھ کو نیشاپور میں انتقال کیا۔ اور اپنے آبائی گاؤں بیہق میں دفن ہوئے[۱۱]

تصنیفات

امام بیہقی صاحبِ تصانیفِ کثیرہ تھے۔ ان کی تمام تصنیفات عمدہ اور جامع ہیں۔ علمائے کرام نے ان کی تصنیفات کی تعریف کی ہے۔ حافظ ابنِ کثیر (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں کہ:

"امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی کی کتابوں کو مختلف شہروں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں تصنیف و تالیف میں یکتا تھے۔ ان کی چھوٹی بڑی تمام کتابیں بے نظیر اور مفید ہیں"[۱۲]

شعب الایمان: اس کا پورا نام "الجامع المصنّف فی شعب الایمان" ہے، اس میں امام صاحب نے صحیحین کی مشہور حدیث — "الایمانُ بِضْعٌ وَ سَبْعُوْنَ شُعْبَةً" کے مطابق ایمان کی ۷۰ شاخوں کی تفصیل و تشریح کی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔

کتاب معرفۃ السّنن والآثار: یہ امام صاحب کی مشہور کتاب ہے۔ اس کا موضوع احکام و مسائل ہے۔ اس کتاب کے شروع میں امام صاحب نے حدیث و سُنّت کی اہمیت، روایتِ اسناد میں احتیاط اور بعض ضروری فنّی مباحث (اجماع، اجتہاد، قیاس، عام و خاص، امر و نہی، دلیلِ خطاب اور ناسخ و منسوخ وغیرہ پر علمی و تحقیقی بحث کی ہے اور اس کے ساتھ امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) کے حالات و کمالات اور اجتہادی مرتبہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کتاب السنن : اس کتاب کا نام سنن کبریٰ بھی ہے۔ یہ امام صاحب کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ صحاحِ ستہ کے بعد جن کتابوں کو غیر معمولی شہرت اور بقائے دوام حاصل ہُوا، اُن میں یہ بھی شامل ہے۔ اس کے بارے میں حافظ ابنِ صلاح (م ۶۴۳ھ) لکھتے ہیں :

" ماتم کتاب فی السنۃ اجمع للادلۃ من کتاب السنن الکبریٰ للبیہقی کانہ لم یترک فی سائر اقطار الارض حدیثا الا قد وضعہ فی کتابہ " [۱۳]

(دلائل کے لحاظ سے بیہقی کی سنن کبریٰ سے زیادہ جامع اور مکمل تصنیف حدیث و سنّت کے ذخیرہ میں موجود نہیں۔ گویا امام صاحب نے تمام حدیثوں کو چھان بین کر کے اس میں جمع کر دیا ہے۔)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ لکھتے ہیں کہ :

" امام بیہقی کی سنن کبریٰ مسائل و معلومات کا گنجینہ ہے۔ اس کے ابواب و تراجم فقہی مسائل ہی کے لحاظ سے قائم کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک ایک حدیث سے مختلف مسائل کو مستنبط اور متعدد ابواب کی تفریع کی گئی ہے۔ اس میں امام بیہقی کے فقہی کمال اور اجتہادی مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ صحابہ و تابعین کے آثار اور ائمہ مابعد کے اقوال و مسالک بھی جمع کیے گئے ہیں — اور ضعیف و قوی اور مرجوح و راجح اقوال میں محاکمہ کیا گیا ہے۔ امام شافعی کے قدیم و جدید اقوال، شوافع کے اصول مذاہب اور دلائل خصوصیت سے ذکر کیے گئے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب لکھ کر انہوں نے امام شافعی پر احسان کیا ہے۔ اس میں ان کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے مختلف فیہ امور و مسائل کے متعلق صرف اپنے فقہی مسلک کی مؤید روایات و احادیث نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ دوسرے مذہب کی مؤید حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے " [۱۴]

(باقی صـ ۶۲ پر)

ہمارے تعلّق بالقرآن کے چند غور طلب گوشے

علاّمہ غلام شبّیر بخاری
سابق ڈائریکٹر محکمہ تعلیمات پنجاب

عالمی بصیرت گواہی دیتی ہے کہ دورِ حاضر تعلیماتِ قرآنی کی نشاۃِ ثانیہ کا دور ہے اور روحانی و فکری نہضتِ جدیدہ کے ممکن مقتضیات کو کماحقہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے مسلسل ارتقائی عمل میں پورے آفاقی الہامی ادبیات میں قرآنِ مقدّس وہ منفرد اور واحد دستورِ حیات ہے جس میں بنی نوع انسان کی ابدالآباد تک جہتی رہنمائی کی ہر صلاحیت موجود ہے۔

مجلسِ اقوامِ متحّدہ کا قیام عصرِ حاضر کا ایک بہت بڑا تہذیبی سمبل ہے جو بلاشبہ فطرتِ انسانی کی یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی کے حکم پر فرمانبردارانہ صدائے لبیک ہے۔ حقوقِ انسانی کا منشور (چارٹر آف ہیومن رائٹس) لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ کا تشنہ سا دیباچہ ہے۔ سود بنیاد عصری معیشت قرآنی انسان دوست قرضِ حسنہ کے معاشی نظام سے یوں متاثر ہو رہی ہے کہ ماہر معاشیات کینز کے مطابق

"The latest thinking on the Theory of Interest is that the rate of interest should be brought down to Zero percent."

بائبل سائنس اینڈ قرآن کے مصنّف بوکائی نے سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا" میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے جو نئے روشن افق دیکھے ہیں ان سے تو چاند پر پہلے انسانی چھوٹے قدم کو آنے والے اَن گنت بڑے قدموں کا پیش خیمہ کہنا پڑے گا۔ گوئٹے نے ایکرمان کو قرآن مجید کے بارے میں یہ کہہ کر متحیر کر دیا تھا کہ ہم اپنے تمام نظام ہائے

مروّجہ میں ناکام ہو گئے ہیں اس قرآن مجید کا نظام ناکام نہیں ہوا - اور آج میخائل گورباچوف کے یہ الفاظ جنہیں امریکی رسالہ ٹائم نے ۴ دسمبر ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں دہرایا ہے کس قدر چونکا دینے والے ہیں، ان کا کہنا ہے :

"We need spiritual values. We need a revolution of the mind. This is the only way towards a new culture and a new politics THAT CAN MEET THE CHALLENGE OF THE TIME."

قرآنِ مقدّس بلاشبہ گلشنِ اقدارِ حیات کا وہ گلِ سرسبد ہے جس کی مہکار گلستانِ کائناتِ فکر و نظر کی سب سے بڑی طلب ہے - رجوع الی القرآن کے اس ہمہ گیر دور میں اگر قائد اعظم محمد علی جناح نے یہ کہا کہ :

"It is the great book Quran that is the sheet anchor of Muslim India" (Dec 1943)

یا قراردادِ مقاصد میں یہ اعلائے کلمۃ الحق ہوا کہ "چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لئے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور پھر دستور مرتب کرنے میں جو مقاصد پیش نظر رکھے گئے ان میں ایک یہ اہم مقصد بھی شامل ہے کہ مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کے قابل بنایا جائے گا" تو یہ امر وقت کے تہذیبی دھارے کے خلاف نہیں ہے بلکہ عصری مقتضیات کے عین مطابق ہے - البتہ ایک زندہ قوم کی طرح ہمیں خود احتسابی کے عمل سے لگاتار گزرتے رہنا چاہئے کہ تعلق بالقرآن، تمسک بالقرآن اور رجوع الی القرآن نے ہمیں گزشتہ سالوں میں زندگی کے اونچے آدرشوں سے کس حد تک ہمکنار کیا اور ہماری زندگیوں میں ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ لانے کے لئے کن کن خوابیدہ مضمراتِ حیات کو بیدار کیا-

مرکزی انجمن خدّام القرآن نے ۱۹۶۹ء میں امیرِ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز مقالہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" شائع کیا تھا اس میں قرآن مجید کے

بارے میں مسلمانوں کی پانچ اہم ذمہ داریوں کا بڑی خوبی سے احاطہ کیا گیا ہے -
پہلی ذمہ داری قرآن مجید پر ایمان لانا ہے اور اس کی کماحقہ تعظیم کرنا ہے گویا قرآن مجید پر ایمان لایا جائے - دوسری ذمہ داری تلاوت و ترتیل ہے یعنی اسے پڑھا جائے - تیسری ذمہ داری تذکّر و تدبّر ہے یعنی اسے سمجھا جائے - چوتھی ذمہ داری حکم و اقامت ہے یعنی اس پر عمل کیا جائے اور پانچویں ذمہ داری تبلیغ و تبیان ہے یعنی اسے دوسروں تک پہنچایا جائے -

محاضراتِ قرآنی کی اس نشست میں آیئے ڈاکٹر صاحب کے وضاحت کردہ ان فرائضِ خمسہ کی روشنی میں اپنے تعلق بالقرآن اور رجوع الی القرآن کے چند غور طلب گوشوں پر نظر ڈالیں - ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم من حیث القوم "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ --- الخ" پر اپنے ایمان کی تجدید کریں کہ لاریب سرورِ کائنات فخرِ موجودات سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور قرآن حکیم پر تکمیل دین ہوگئی' اس کے بعد نہ کوئی پیام بر ہے نہ کتاب - قرآن مجید غیر محرف و غیر مبدّل صحیفۂ آسمانی ہے - **بفحوائے** "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ" - احکامِ قرآنی کا اتّباع نہ کیا جائے تو یہ فسق ہے' ظلم ہے اور کفر ہے - قرآن مجید ادبیاتِ عالیہ کا شاہکار ہے اور یہ اس سرچشمۂ رشد و ہدایت کا تسلسل ہے جس کے پہلے ساقی سیدنا آدم علیہ السلام تھے -

آج اگر کوئی نام نہاد طبقۂ اہلِ دانش بائبل کے انگریزی ترجمے کو تو ادبیاتِ عالیہ میں شمار کرتا ہے مگر عبداللہ یوسف علیؒ کے انگریزی ترجمۂ قرآن کریم یا شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمۂ قرآن مجید یا ابوالکلامؒ آزاد کے اردو ترجمۂ قرآنِ کریم کو ادب ماننے سے انکار کرتا ہے' یا الہامی کتابوں کو نفرتوں کے صحیفے گردانتا ہے' یا "ابیاتِ شیطانی" کی طرح کے گمراہ کن لٹریچر کو ادبِ عالیہ میں شمار کرتا ہے تو قرآن مجید کی اہانت کا ارتکاب کرتا ہے اور ہماری ایمانیات کا تقاضا ہونا چاہیئے کہ اہانتِ قرآنِ حکیم کو تعزیری جرم قرار دیں اور اس کی سخت سے سخت سزا ہو -
ہمارے قرآن مجید پر ایمان کا یہ تقاضا بھی ہے کہ اس کی صحّتِ اشاعت کا اہتمام ہو - اسے نفع اندوز تاجروں کی لوٹ کھسوٹ سے بچایا جائے - محکمہ اوقاف باقی اسلامی ملکوں کی طرح قرآن مجید کی صحت طباعت اور اس کے معیاری تراجم اور عربی' فارسی' انگریزی' اردو تفسیروں کی اشاعت کا نظام اپنے ہاتھ میں لے یا ایسے نیک نہاد اور خدا خوف مسلمانوں

کی کارپوریشنوں کے حوالے کرے جس سے عامتہ المسلمین کو اس منبعِ نور سے حصولِ نور میں ہر ممکن سہولت ہو - ناقابلِ استعمال کاغذوں پر درج آیاتِ قرآنی کے ڈسپوزل کا مناسب انتظام قرآن مجید کے احترام کا ایک اہم حصہ ہے - ہر رمضان المبارک قرآن کریم کی سالگرہ ہے - اس ماہ مبارک میں عمدہ سے عمدہ نسخہ ہائے قرآنی کی نمائش کا انعقاد ہو' قرآن مجید کے دنیا بھر کے منتخب قراء کے کیسٹ مہیا ہوں' ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پروگراموں میں قراءت کی محفلوں کو زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہو - آیاتِ قرآنی کی عظمت پتھر دل کافروں کے دلوں میں اتر جاتی تھی اِس دَور کے مسلمانوں کے دل ان سے زیادہ سخت نہیں ہیں - کتبِ قراءت وتجوید' ترجمہ و تفسیر کا زیادہ سے زیادہ فروغ اور مجالسِ قراءتِ قرآنی کا وسیع سے وسیع تر پیمانے پر انعقاد ہمارے ایمان بالقرآن کی تقویت کا باعث ہوگا اور عالمی سطح پر قراءت وتجوید کے ایمان پرور اجتماعات کرکٹ اور ہاکی کے میچوں سے زیادہ ایمان افروز ثابت ہوں گے -

---

ڈاکٹر صاحب نے قرآن حکیم کا دوسرا حق تلاوت و ترتیل قرار دیا ہے گویا قرآن مجید کو "رَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا" کے حکم کی تعمیل میں ترتیل سے پڑھا جائے - اعضاء الصّوت پر ضبط ہو' ذ' ز' ض اور ظ' ہ اور ح' ق اور ک' حروف الگ الگ ادا ہوں - ترقیق اور تفخیم کا پورا پورا لحاظ ہو - فوائد مکیہ' ہدیۃ الوحید' جمال القرآن جیسے رسالے یا ان کے مختصر اور اہم حصے کثرت سے چھپوا کر عام کئے جائیں تاکہ ناظرہ پڑھانے والوں کی رہنمائی ہو سکے - قراءت اور تجوید میں ڈپلومہ کورسز ہوں اور ڈپلومہ ہولڈر قراء کو دو دو تین تین پیشگی ترقیاں دی جائیں' پھر دیکھیں قرأت و تجوید میں انہماک کیسے بڑھتا ہے - میں نے بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن اور بہاولپور' ملتان' پنجاب یونیورسٹیوں میں چانسلرز کمیٹی کے رکن کے طور پر یہ تجاویز پیش کی تھیں اور انہیں اس وقت بڑا سراہا گیا لیکن بوجوہ بات آگے نہ بڑھی - میری اب بھی یہی رائے ہے کہ اگر تجوید اور قرأت کو باضابطہ فروغ نہ ملا تو ناظرہ خوانوں میں صحتِ تلفّظ ہمیشہ محلِ نظر رہے گی -

اب آیئے اصل مسئلے کی طرف' ہماری کم و بیش دس کروڑ اسی لاکھ مسلمان آبادی علاوہ غیر مسلموں کے' میں سے ایک کروڑ بچے ہیں جن میں سے تیس چالیس لاکھ حصولِ تعلیم

کے حق سے محروم ہیں باقی پچپن ساٹھ لاکھ کا بمشکل دس فیصد قرآن مجید ناظرہ پڑھ سکتا ہے۔ آخری پارے کے ربعِ آخر کا ترجمہ ایک فیصد اور کسی قدر ابتدائی تفسیر ۵ فی ہزار۔

اسلامی اسکولوں کو قومیانے سے پہلے ان میں ایک بڑی تعداد ان اسکولوں کی تھی جن میں قرآن مجید ناظرہ پڑھانے کا انتظام تھا۔ جبکہ ان کے ہم عصر سرکاری اسکولوں میں ایسا انتظام نہ تھا۔ قومیانے کے بعد ان اسلامی مدارس کے قرآن مجید پڑھانے والے قاری اساتذہ اس لئے بجٹ میں ضم نہ ہو سکے کہ سرکاری بجٹ میں اس اسامی کی منظوری نہ تھی' عوامی دباؤ سے کبھی کبھار چند اسامیاں مل گئیں لیکن ان سے قرآن مجید کی تعلیم کا نظام برپا نہ ہو سکا۔ میرے محترم بھائی حافظ نذر احمد کی ترغیب سے ایک نو مسلم مجاہد اسلام الحاج محمد یوسف سیٹھی نے مالی اعانت اور قاریوں کی تربیت کی پیشکش کی جسے "اسلامی حکومت" نے بادلِ نخواستہ منظور کر لیا۔ سیٹھی ٹرسٹ کے نگران محمد یوسف سیٹھی نے اسلامیہ ہائی سکول لاہور میں قاریوں کی تربیت کا بڑا اچھا انتظام کر دیا۔ یہ کام مفید نتائج پیدا کر سکتا تھا لیکن اربابِ حکومت میں ایک طبقہ ایسا تھا جن کا اصول تھا کہ نہ تو اس ملک کی تعلیم کو خود بہتر کرنے کی سعی کرنا ہے اور نہ ہی کسی اچھی سعی کو جاری رہنے دینا ہے پھر آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند۔ چنانچہ ۱۹۹۰ء کے نظامِ مدارسِ سرکاری میں قرآن مجید کی تدریس کا مناسب انتظام نہیں ہے۔ کوئی سکول کا بچہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا جس نے کسی سرکاری سکول میں قرآن مجید ناظرہ ختم کیا ہو۔ ہاں مکاتب اور گرانٹ لینے والے دینی مدارس اور ان کے مولوی شاید اس سے مستثنیٰ ہوں۔ خدا بھلا کرے محلوں کی مسجدوں میں بچوں اور بچیوں کو قرآن مجید پڑھانے والے آئمہ مساجد کا اور ان دین دار ماؤں کا جنہیں بچوں کی دینی تعلیم کا شوق ہے ------ کہ قرآن مجید ناظرہ میں کچھ کام ہو رہا ہے لیکن اس میں حکومت کا کم سے کم دخل ہے جس نے قرآن و سنت پر اپنے نظامِ حکمرانی کی بنیاد رکھی ہے۔ جب قرآن مجید کسی نے پڑھا ہی نہ ہوگا' اس کا ترجمہ ہی نہ جانتا ہوگا' اس کے مفاہیم عالیہ سے آگاہ ہی نہیں ہوگا تو کیسا دستور' کیسا نفاذ شریعت اور کہاں کا اسلامی نظامِ حیات!

اس سے بہتر طریقہ کار تو اسلامی ریاست بہاولپور نے اختیار کیا تھا۔ ہمارے ملک کے دانشوروں نے بہاول پور کے نوابوں کو یہ احساس دلایا کہ وہ عباسیوں کی علمی روایات کے

امین ہیں اس لئے اسلامی تعلیمات میں اپنا تاریخی رول ادا کریں - ۱۹۴۱ء میں مولانا ظفر علیخان نے وہاں کی دینی فضا سے متاثر ہوکر کہا تھا ؎

روایاتِ سلف کی رونقیں گلشن بداماں ہیں
نظر اربابِ بینش کی پہنچ سکتی جہاں تک ہے !

خوشی محمد ناظر نے کہا کہ ؎

ترے اجداد نے بغداد دجلے پر بسایا تھا
تو ستلج کے کنارے پر نیا بغداد پیدا کر

چنانچہ بغدادِ جدید میں علمی روایات کا احیا ہوا - دینی درس گاہ جامعہ عباسیہ اور اس کے ساتھ عربی کالج اور مدارس قائم ہوئے - اور اس کے ساتھ مصر کے جامعہ ازہر اور ندوۃ العلما کا قیام تجویز ہوا - اس فضا میں تعلیم عام کرنے کی ایک تنظیم مکاتب کی اسکیم نافذ کرنے کی سعادت مجھے مقدر ہوئی - ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۱ء تک چار ہزار دیہات کا سروے ہوا - علاقے کو پندرہ ٹیموں کی سپردگی میں بانٹا گیا - آئمہ کی تربیت کا انتظام ہوا ' مسجد کمیٹیوں کے تعاون سے خواندہ آئمہ کا تقرر ہوا - کامیاب مکاتب کو بچوں کی تعداد، معلّم کی استعداد ' لوگوں کی امداد کے پیش نظر گورنمنٹ نے گرانٹ دی ' اچھے مکاتب میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہوا اور ان کا معیار عام ابتدائی مدارس سے بلند ہوگیا - میں نے محکمہ تعلیم سندھ ' بلوچستان ' سرحد ' آزاد کشمیر اور پنجاب کے کمیشنوں کے ذریعے سے اس تجربے کو جانچا ' پرکھا اور قبول کیا - ملکی اور غیر ملکی پچاس سے زائد ماہرین تعلیم نے اس کی افادیت پر مہر تصدیق ثبت کی - میرے نزدیک سب سے زیادہ خوبی کی بات یہ تھی کہ ان مکاتب میں ناظرہ قرآن مجید پانچویں جماعت تک مکمل ہو جاتا تھا البتہ جہاں جہاں حفظ کا انتظام کیا گیا وہاں دو سال زائد صرف کرنا ہوتے تھے -

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ' میاں افضل حسین ' ڈاکٹر محمود حسن ' ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ ' علامہ علاؤ الدین صدیقی کے تعاون سے ایوب خان ' یحییٰ خان ' ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق کے ادوار میں مکاتب کا قیام ہماری قومی تعلیمی پالیسی کا حصہ بنا - شہری مکاتب کیتھڈرل اور کانونٹ سکولوں کو مات کر سکتے تھے لیکن یوں محسوس ہوا کہ دیہاتی ائمہ میں مخلصانہ کام کی لگن زیادہ ہے - میں نے ایک سیکرٹری صاحب کو جو مکاتب کے مسجد سے تعلق پر ہمیشہ

معترض رہتے تھے ایک کیتھڈرل کے پاس اپنے بچے کے انتظار میں کار لیے کھڑا دیکھا تو ان سے سوال کیا کہ حضرت! یہ بھی تو چرچ اسکول ہے لیکن ان کی سی ایس پی ایت سے کوئی بات بنی نہیں البتہ یہ کہا کہ کیا ہمارا ملّا یہ چیلنج قبول کرنے کو تیار ہے؟ کہ اسی معیار کی تعلیم گاہ مہیّا کر سکے - یہی سوال میں بصد ادب آپ کے سامنے دہرا رہا ہوں -

یہ مکتب بلاشبہ قرآنی ادارے ہیں - ان کا اجراء' استحکام اور ان کے لئے ایک مربوط نظام آج بھی ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے - اگر حکومت ان کی سرپرستی میں سرگرم نہیں تو ہماری اسلامی انجمنیں اور قرآنی ادارے اس اہم ترین خدمت میں آگے بڑھ سکتے ہیں - اپنی قوم کے نونہالوں کو مسیحیت کی آغوش میں پلتے دیکھ کر کبھی تو غیرت بیدار ہو - ہر صوبائی حکومت کو اس اہم فروگزاشت کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کے سکولوں میں قرآن مجید کی تدریس کا کوئی انتظام نہیں -

---

ڈاکٹر صاحب نے تلاوت و ترتیل کے بعد قرآن مجید کا تیسرا حق تذکّر و تدبّر قرار دیا ہے یعنی قرآن مجید کے مفاہیم کو سمجھا جائے اور اس پر تدبر کیا جائے - اس حق کے پاسدار ہمارے اعلیٰ تعلیمی ادارے 'کالج' یونیورسٹیاں اور دینی جامع العلوم ہیں - مدارسِ دینی کا ایک مفید اور جامع جائزہ برادر محترم حافظ نذر احمد نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا - شاید اس پر مزید کام بھی ہوا ہو - اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ ان اداروں کے نصابات' امتحانات اور تعلیمی معیارات پر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے - مجھے محکمہ تعلیمات مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کے مدرسہ بورڈ کے خطوط پر مغربی پاکستان کے لئے بورڈ تشکیل دینے کا منصوبہ سونپا تھا - میں نے کم و بیش ایک ماہ وہاں کے اداروں کا معائنہ کیا اور وہاں کے اداروں کی بعض صحت مند روایات کو اپنے ہاں رائج کرنے کی اہمیت' وہاں کی کمیٹی برائے نصابات اور مدرسہ بورڈ امتحانات پر ایک مفصّل رپورٹ پیش کی لیکن سیاسی حالات کے بدل جانے' جنگ کے ہنگامی حالات اور نظامِ حکومت میں تبدیلی میں وہ سارا دفتر گاؤ خورد ہو گیا - مدرسہ بورڈ قائم نہ ہو سکا الگ الگ مسالک کے وفاق قائم ہوئے - لیکن ان کا محورِ فکر بڑا محدود تھا اور اکثر مہتمم صاحبان کو اعتراف ہے کہ 'شمسِ بازغہ' اور 'مسلّم العلوم' تو کیا' شرح جامی' پڑھانے والے اساتذہ بھی دستیاب نہیں ہیں - اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے شاید مجھ سے ایک گناہ ہی سرزد ہوا کہ ان مدارسِ عربیہ کے طرز پر میں نے چاہا کہ بہاولپور میں بلند معیار

جامعہ عباسیہ اسلامیہ یونیورسٹی بن جائے اور اس کے نصاب میں مشرقی اور مغربی علوم کا حسین امتزاج ہو - اتفاق سے میں تین سالوں کے لئے تعلیم سے اوقاف میں چلا گیا اس سے یہ مرحلہ کسی قدر آسان ہوگیا - شیخ محمد اکرام مرحوم کی مخلصانہ کوششوں سے محمود حسن کمیٹی ' شیخ اکرام کمیٹی ' اور قبل ازیں سلمان ندوی کمیٹی اور شبیر احمد عثمانی کمیٹی (مولانا عثمانی کا انتقال بھی بہاول پور میں ہوا جب وہ نصابی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے یہاں آئے ہوئے تھے) کی سفارشات سے ایک جامع نصاب مرتب ہوا لیکن ایک اہم مسئلے سے صرفِ نظر ہوگیا - بعض درجات میں جدید اور قدیم علوم کا نالج ایریا بہت بڑھ گیا اس لئے کچھ مضامین کے ساتھ "بہ تخفیفِ موزوں" کے الفاظ ایزاد کر دیئے گئے جو آج تک اسی طرح قائم ہیں - خدا کرے کوئی ایسا معلم آئے جو اس نصاب کو نافذ کرے اور 'تخفیفِ موزوں' کے معانی کھلیں -

دوسری طرف درسِ نظامی کا مستند اور مستحکم ادارہ دیوبند اور بریلی کی عصبیتوں کی بھینٹ چڑھ گیا - شیخ التفسیر دیوبندی تھے ' شیخ الحدیث بریلوی ' ایک ہی ادارے میں الگ الگ جماعتیں شروع ہوئیں ' پھر استادوں کی بے عزتی ہوئی ' فائرنگ ہوئی اور قدیم علوم کا یہ گہوارہ نئے علوم میں تو شرکت نہ کر سکا البتہ اس نے نئے کلچر ' کلاشن کوف کلچر سے پوری آگہی اختیار کر لی - وہ ادارہ جسے پاکستان کا مدرسہ عالیہ بغداد اور جامعہ ازہر قاہرہ کا جواب بننا تھا آج پوری قوم کے سامنے سوال بن کر رہ گیا ہے - ؎

داغِ فراق و صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

جو نصاب سالہا سال کی محنت سے تیار ہوا ' اس پر پھر نظرِ ثانی ہوئی ' اسے اداروں کے مشورے سے تیار کیا گیا تھا لیکن کسی ادارے نے بھی اسے قبول نہ کیا - نہ ارباب اختیار کو اس میں دلچسپی تھی چنانچہ جس طرح سیاست کاروں کی مستحکم تربیت گاہ نہ ہونے کے سبب سے ان میں تشتتِ فکری نے جڑ پکڑ لی ہے اسی طرح اعلیٰ دینی اداروں میں ہم آہنگیٔ فکر نہ ہونے کے سبب سے وہ قوت نہیں پیدا ہو سکی جو انہیں ہندوستان یا ایران کی علمی دریوزہ گری سے بے نیاز کر سکے - آج کے غلام علی گڑھ ' دیوبند ' بریلی اور سہارنپور آزاد پاکستان کی رہنمائی نہ کر سکے ۔شاید ایران کے حالات کا ہمارے ملک کے حالات سے اس موقع پر حوالہ

مفید نہ ہو - پاکستان میں اعلیٰ دینی اداروں کے سربراہوں سے باادب گزارش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

تا کجا در تہِ بال و گراں می باشی
در ہوائے چمن آزاد پریدن آموز

اس بندۂ عاجز نے اوقاف کے اربابِ اختیار سے درخواست کی تھی کہ دینی اداروں کے مستند علماء پر مشتمل ایک کمیشن جامعہ ازہر، دمشق، بغداد، دیوبند، بریلی، دلی، جکارتہ، مدینہ منوّرہ اور دیگر مقامات کے تعلیمی اداروں میں مطالعاتی دوروں پر بھیجیں - واپسی پر وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اپنے ملک میں قرآن مجید کے اس تیسرے حق کو ادا کرنے کی سعی کریں -

---

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہم پر قرآن مجید کا چوتھا حق حکم و اقامت ہے یعنی قرآن مجید کی تعلیمات پر عمل کیا جائے - اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں حکومتِ اسلامی نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ " ایسے اقدامات کئے جائیں گے کہ مسلمان کتاب و سنت کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں " -

ایک عرصے تک نفاذ شریعتِ قرآنی کی بال گورنمنٹ کے کورٹ میں رہی پھر علماء کونسل اور مجلسِ شوریٰ کے کورٹ میں پہنچی وہاں سے پھر اسلامائزیشن کمیٹی کو منتقل ہو گئی - ایک حالیہ اعلان کی رو سے سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس اس اہم ترین خدمت پر مامور ہوئے ہیں - ہمارے محلوں کے نیک نہاد آئمہ مساجد پانچ وقت ہر نماز میں دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ ! اس ملک میں قانونِ شریعت کا نفاذ فرما اور دلوں سے صدقِ دل سے آمین نکلتی ہے - یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ جارج واشنگٹن اور ابراہیم لنکن کو تو امریکہ میں جمہوریت نافذ کرنے یا مرد آہن سٹالن کو کمیونزم نافذ کرنے یا ماؤزے تنگ کو چینی اشتراکیت برپا کرنے میں تو لیت و لعل کے یہ ہفت خواں سر نہیں کرنے پڑے جو ہمارے اربابِ اختیار کو گزشتہ بیالیس سال سے درپیش ہیں - یہ کیا اندھیر ہے کہ پاکستان کا ہر حکمران جس دستور پر حلف اٹھا کر زمام اختیار سنبھالتا ہے کسی کو بھی آج تک توفیق نہیں ہوئی کہ دستور ملکی کی محولہ بالا دفعہ نافذ کر دے - ع کو خویشتن گم است کرا رہبری کند -

ترکی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ مچھلی سر سے سڑنا شروع ہوتی ہے - جب ملک کے ایم

این اے ' ایم پی اے اور اربابِ اختیار کی اکثریت تعلیماتِ قرآنی کی الف با تا سے ناواقف ہے تو اسلامی زندگی ' اسلامی تہذیب ' اسلامی ثقافت کے الفاظ لغت کی زینت ہی بنے رہیں گے - مجھے لندن کے کچھ پادریوں نے بتایا کہ ان کی تربیت کے دائرے الگ الگ ہیں - ایک صاحب نے میئروں کی تربیت کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے ' دوسرے نے پارلیمنٹ کے دس اراکین کی ' تیسرے نے چیمبر آف کامرس کے چیئرمین کی - وقس ہذا - مشہور سیاسی لیڈر رچرڈ اٹیلی نے کہا کہ ہم نے تاجروں ' صنعت کاروں ' سیاست دانوں ' دانشوروں ' ماہرین معاشیات ' ماہرین تعلیم کو کماحقہ پارٹی مینی فسٹو کی تعلیم دے دی ہے بلکہ شیڈو کیبنٹ بھی مقرر ہے جو موقع ملنے پر چوبیس گھنٹے میں اپنی نئی ذمہ داریوں کا جائزہ لے سکتی ہے -

ہمارے ہاں ایک صدر صاحب نے جب اسلامی ثقافت کے فروغ کا کام ایک ایسے سی ایس پی افسر کو مرحمت فرمایا جن کا اسلام اور اسلامی ثقافت سے دُور کا واسطہ نہ تھا تو میرے ایک دوست نے انہیں کہا کہ آپ نے تو یوں کیا ہے جیسا کہ یزید کو کہا جائے کہ وہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں قصیدہ مدحیہ پیش کرے -

اگر ایک حاکم اپنے چھ فٹ طویل جسم پر اسلام نافذ نہیں کر سکتا تو وہ پورے ملک میں اس کا نفاذ کس طرح کر سکتا ہے - اسلامی نظام زندگی کے نفاذ میں تاخیر سے آج پورا ملک بدترین معصیت کوشیوں کی گرفت میں ہے اور اس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے کہ صدر مملکت کے نزدیک ملک کی سب سے بڑی منتخب اسمبلی ہارس ٹریڈنگ کا طویلہ ہے جس میں وزیر اعظم کے بقول فرد کی قیمت دو کروڑ روپیہ بھی ہو سکتی ہے - جہاں زبان ' ذہن ' ضمیر بکاؤ مال بن گئے ہوں وہاں تعلیمات قرآنی کا نفاذ چیلنج ہے ' اہل فکر و نظر اسے قبول کریں -

---

ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کا پانچواں حق یہ قرار دیا ہے کہ اس کی تعلیمات دوسروں تک پہنچائی جائیں یعنی تبلیغ و تبیان - ادیانِ عالم کے تقابلی مطالعے کے ماہرین نے اسلام کو تبلیغی مذہب تسلیم کیا ہے - اس دین کا مزاج ابلاغ انسانی فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے - آج کرّہ ارضی کی انسانی آبادی میں ہر تیسرا یا چوتھا انسان مسلمان ہے - مبلّغ قرآن کو ایک سطح پر تو مسلمانوں میں تعلیماتِ قرآنی کا فہم پیدا کرنا ہے اور دوسری سطح پر غیر مسلموں کو دعوتِ اسلام دینا ہے - اس کے لئے عالمی سطح پر ایک تبلیغی ادارے کی جتنی آج ضرورت

ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھی - مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) میں محکمہ اوقاف نے حکومتِ مصر و شام اور سعودی عربیہ کے تعاون سے دار المبلّغین کی ایک عالمی تنظیم کا ابتدائی خاکہ تیار کیا تھا لیکن بوجوہ اس میں رنگ آمیزی نہ کی جا سکی - بالآخر کوئٹہ میں ایک علماء اکیڈمی قائم کی گئی جو بعد میں لاہور منتقل ہو گئی - کوئٹہ اکیڈمی میں ایک دلچسپ منظر مشاہدے میں آیا - اکیڈمی ہاسٹل میں چاروں مسالک کے ائمہ وخطباء (دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ) کو ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق یکجا رکھا گیا - تعجب ہوا کہ مساجد میں فرقہ واریت کے ہنگاموں کو برپا رکھنے والے ائمہ بھی بڑی محبتِ باہمی سے گزر بسر کر رہے تھے - ایک دوسرے کے پیچھے باری باری نماز پڑھ لیتے تھے، آپس میں کوئی ایسا موضوع زیر بحث نہیں لاتے تھے جس سے بدمزگی پھیلنے کا اندیشہ ہوتا - اگر کسی سے لغزش ہو جاتی تو بڑی وسعتِ قلبی سے معاف کر دیتے - ہر امام ایسے مسائل بیان کرنے میں زیادہ انہماک کا اظہار کرتا جن میں اخوتِ باہمی، یگانگت اور یکجہتی جذبات کو فروغ ملتا اس ماحول نے منتظمین کی رہنمائی کی اور ائمہ و خطبا کی باہمی مشاورت سے ایسے خطبات ترتیب دیئے جا سکے جن پر زیادہ سے زیادہ ائمہ کا اتفاق تھا - انہی دنوں فیروز سنز کے مرتّبہ ۵۲ خطبات بھی مہیّا تھے - ان سے فائدہ یہ ہوا کہ مختلف مسالک کے پابند ائمہ و خطبا میں تعلیماتِ قرآنی کی تبلیغ میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی - تجربے نے بتایا کہ بحمد اللہ اعتدال پسند مبلّغین کے تعاون سے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا ممکن ہے البتہ پیغام یہ ہونا چاہئے کہ لوگو! مجھے قینچی نہ دو سُوئی دو - میں سینے کے لئے آیا ہوں کاٹنے کے لئے نہیں -

ان ۵۲ خطبات کے پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو میں تراجم ہوئے جن سے ہر صوبے میں تبلیغی کام میں مدد ملی - پروگرام میں یہ منصوبہ بھی داخل تھا کہ ان خطبات پر ہر چار سال بعد نظر ثانی کی جاتی رہے، ان کا عربی، فارسی اور انگریزی میں ترجمہ کیا جائے اور اکیڈمی عرب ممالک، ایران، افغانستان اور انگلستان وغیرہ میں تبلیغ دین کے لئے مبلغین تیار کرے - ''گرین بک'' کے عنوان سے ہندو مت، بدھ مت، عیسائیت، یہودیت، کمیونزم وغیرہ دس مذاہب سے اسلام کے تقابلی مطالعے پر مشتمل ایک کتاب مبلّغین کی رہنمائی کے لئے تیار کی گئی - دراصل یہ تبلیغی کام زیادہ خوبصورتی سے ہمارے دین دوست حضرات سرانجام دے سکتے ہیں - ایک مرکزی دار المبلّغین ہو جو علاقائی زبانوں، قومی زبانوں اور بین الاقوامی

زبانوں میں مبلغین کے گروہ تیار کرے ' انہیں زبان و بیان ' فلسفہ و منطق ' کلام و لغت ' بحث و مباحثہ کی فنی تربیت ہو اور انہیں عند الطلب غیر ملکی خدمات کے لئے بھیجا جائے -

ہمارے کراچی ' ملتان ' لاہور ' اسلام آباد اور پشاور ' کوئٹہ کے ادارے اس ضمن میں بڑا کام کر رہے ہیں - محترم ڈاکٹر اسرار احمد اور ان کے ایثار پیشہ ساتھی بھی قابل تعریف انہماک سے مصروف عمل ہیں ' اللہ تعالیٰ ان کے ارادے میں برکت دے لیکن خوب سے خوب تر کی جستجو جاری رہنی چاہئے -

اس عاجز کے نزدیک ایک ایسا شعبۂ تحقیق قرآن اکیڈمی میں قائم ہو جو ان تمام اعتراضات کے مدلل جواب دینے کی مسلسل کوشش کرتا رہے جو دنیا کے کسی بھی حصے میں قرآن پر اٹھائے گئے ہوں - میرا خیال ہے ' ابیاتِ شیطانی ' کا جواب ------ ابھی ہمارے ذمہ باقی ہے - اسی طرح امریکہ میں مجھ سے کئی جگہ لوگوں نے پوچھا کہ شیخ محمد اشرف جو تبلیغی رسالہ ، اسلامک لٹریچر شائع کرتے تھے ' وہ کیا ہوا - ان کا خیال تھا کہ انگریزی زبان جاننے والوں میں اس رسالے نے جو کام کیا ہے وہ اب تک کوئی اور ادارہ نہیں کر سکا - اسی طرح انگلستان ' امریکہ اور کینیڈا کے مسلمان چاہتے ہیں کہ انہیں اور ان کے بچوں کے لئے قرآنی لٹریچر شائع ہو - یہ عجیب بات ہے کہ ہم بچوں کے لئے قرآن مجید بھی تیار نہیں کر پائے ہیں - ایک قاری صاحب نے چھوٹے بچوں اور بچیوں کو (عمر دس تا بارہ سال) سورۂ بقرہ کے معانی پڑھانے شروع کئے تو [illegible] ... اور ... فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ ... کے معانی اس عمر کے بچوں کو سمجھانے میں پریشانی [illegible] - اسی طرح ادارہ تحقیق موجودہ فراہم تراجم پر بھی غور کرے -

مجھے وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَهَدٰى کے معنی سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی دقت پیش آئی - حضرت شاہ ولی اللہ راہ گم شدہ کہتے ہیں شاہ عبد القادر بھولا بھٹکا مودودی صاحب ناواقفِ راہ اور لغت میں اس کے معانی گمراہ ' حیران ' کھویا ہوا ' تنہا اور راہ تلاش کے ہیں - میں نے اس کے لئے راہ تلاش کو صحیح ترین پایا کہ اس سے پیغمبرانہ عظمت پر حرف نہیں آتا - اسی طرح بے شمار الفاظ و محاورات ہیں جن کے معانی اس لئے بھی زیادہ موزوں تلاش نہیں ہو سکے کہ اُس وقت لغت و تفسیریوں بسہولت مہیا نہیں تھیں جس طرح آج ہیں - یہ شعبۂ تحقیق دنیا کی مذہبی کتابوں پر بھی کام کرے اور کتبِ ادیانِ ماسبق میں اُن مفاہیم کو تلاش کرے جو

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

مؤلف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم: ڈاکٹر ابصار احمد

منشورِ اسلام (۱۵)

فطری نظریۂ حیات (دینِ اسلام) کے مناسکِ عبادت اور مذہبی اداروں میں تبدیلی نہیں ہوتی!

وہ مناسکِ عبادت اور مذہبی ادارے جو کسی فطری نظریۂ حیات سے متعلق ہوتے ہیں، تبدیلی یا ردّوبدل کے عمل سے نہیں گزرتے۔ ارتقائی عمل کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ اپنی اصلی شکل ہی میں برقرار رہیں۔ جس طرح حیوانات کی ایک نوع بعض ایسے نسلی مادّی امتیازات رکھتی ہے جو اسے دوسری انواع سے ممتاز کرتے ہیں، بعینہٖ اسی طرح ایک فطری نظریاتی اجتماعیّت (جو فطری یعنی نبوّت کی عطا کردہ تعلیمات کی پیروی کرتی ہے) کے بھی مخصوص اوصاف ہوتے ہیں جو اسے دوسری اجتماعیّتوں اور گروہوں سے جدا کرتے ہیں۔ ان نظریاتی اوصاف کا تعلّق اُن عبادات کے طریقوں اور مذہبی معاملات سے ہے جو رسول اور اس کے فوراً بعد اس کے متّبعین اپناتے ہیں۔ جس طرح حیوانات کی کوئی نوع اپنے مخصوص کوالف کو کسی بنیادی نوعی تبدیلی کے بغیر تبدیل نہیں کرسکتی اسی طرح کوئی نظریاتی کمیونٹی کسی دوسری نظریاتی کمیونٹی میں تبدیل ہوئے بغیر اپنے بنیادی نظریاتی اوصاف میں ردّوبدل گوارا نہیں کرتی۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں جہاں تک نوعی فرق کا تعلق ہے کوئی نوع اپنے مخصوص جسمانی اوصاف اُسی وقت ترک کرتی ہے جب اس کا شعور ایک زقند لگا کر دوسرے نوعی اوصاف اپناتا ہے اور اس طرح بالکل نئی حیوانی نوع معرضِ وجود میں آتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسان کے صفحۂ ہستی پر ظہور کے بعد ارتقاء کا یہ طریقہ ختم ہوچکا۔ اب کائنات کے اختتام تک انسان اپنی موجودہ جسمانی وضع قطع اور اوصاف کے ساتھ موجود رہے گا اور کوئی اعلیٰ نوع اسے ختم نہ کرے گی۔ یہی معاملہ نظریاتی ارتقاء کی صورت میں بھی ہے۔ نظریاتی ارتقاء گزشتہ تمام نبیوں کی بعثت تک ہوتا رہا، لیکن پیغمبر آخر الزمان کی بعثت کے ذریعے دنیا میں

آخری نظریۂ حیات اور آخری نظریاتی کمیونٹی معرضِ وجود میں آئے۔ اور اب اِس نظریۂ حیات کے مخصوص مناسکِ عبادات اور مذہبی احکام رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔ یہ بذاتِ خود انسان کے فکری ارتقاء میں کبھی بھی رکاوٹ کا باعث نہ ہوں گے بلکہ ہمیشہ انسان کی ترقی اور ذہنی و فکری بالیدگی کی ضمانت دیں گے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ ان کا تعلّق کائنات کے تخلیقی ارادے یعنی مشیّتِ ایزدی سے ہے۔

خود شعوری کی اعلیٰ معراج صرف خاتم الانبیاء کی اُمت کے لیے ہے!

چونکہ صرف خاتم الانبیاء کی تعلیمات ہی جامع ہیں اس لیے صرف وہ ہی پُوری نوعِ انسانی کو ایک فکری وحدت میں سمو کر انہیں خود شعوری کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچا سکتی ہیں۔ حیوانی سطح پر ارتقائی عمل نے صرف ایک جہت اختیار کی تھی، یعنی حیات کے لیے جسمانی طور پر زیادہ موافق انواع کی صورت گری۔ انسان کے ظہور کے بعد اب اہمیت افکار کی ہے اور اس ضمن میں نبیِّ آخر الزماں کی تعلیمات رہتی دنیا تک ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

جیسا کہ قبل ازیں کہا جا چکا ہے ارتقاء کے عمل میں صرف تخلیق شدہ انواع کی مساعی ہی کو دخل نہیں ہوتا بلکہ اس میں کائنات میں پوشیدہ اُن قوتوں کی بھی اہمیّت ہے جو خالقِ کائنات نے اس میں رکھ دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام حیواناتی انواع کوشش کے باوجود انسانی شکل میں اپنا ارتقاء حاصل نہ کر سکیں۔ اسی کا مظہر انسانی سطح پر یوں ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے انسانی تمدّن جو پیغمبرِ آخر الزمان کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوتے، اپنے طور پر اور اپنے تصوّر کے مطابق عبادت کے اطوار اور اخلاقی اعمال اپناتے ہیں، تاہم ربِّ کائنات اُن کی ان مساعی کو شرفِ قبول نہ بخشے گا اور اس وقت تک ان کے فکری ارتقاء کا سامان نہ ہوگا جب تک وہ اپنا دامن خاتم الانبیاء کی دعوت سے وابستہ کر کے اس کی کامل اطاعت نہیں کرتے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بھی صرف وہی انسانی تمدّن فکری و تہذیبی ارتقاء حاصل کر سکے تھے جنہوں نے انبیاء کی تعلیمات پر ایمان لا کر ان پر عمل کیا تھا۔ یہی تعلیمات جامعیت کے ساتھ انسانی ارتقاء اور نمو کی ضمانت دے سکتی تھیں۔

دینِ فطرت تاقیامت اپنی اصلی حالت پر برقرار رہے گا۔

سطورِ بالا سے اس حقیقت کی وضاحت بتمام وکمال ہوجاتی ہے کہ دینِ فطرت یعنی اسلام کی بنیادی تعلیمات بعینہٖ انہی خطوط کے مطابق جاری رہیں گی جن پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں استوار کیا تھا چاہے کچھ لوگ اس میں تبدیلی یا کتر بیونت کی کتنی ہی کوششیں کریں۔ ان کی یہ مساعی ہر اعتبار سے بے سُود رہیں گی، چاہے وقتی طور پر ان کی موشگافیاں معدودے چند لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیں۔ اس کا سبب دینِ متین کی تعلیمات کا عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہونا ہے۔ کوئی بھی مذہب اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اس کے معتقدین فکری بدعات اور تحریفات کے خلاف پوری قوّت سے جمے رہتے ہیں۔ دین یہ گوارا کرلیتا ہے کہ اسے ترک کردیا جائے لیکن یہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ اس میں انسانی افکار کو خلط ملط کردیا جائے۔ انسانی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ دین جو اُس کے ذوقِ حسن کو کامل تسکین بخشتا ہے، ہر قسم کے ردّوبدل سے بالاتر رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہی افرادِ انسانی اپنے کمالِ ارتقا تک پہنچتے ہیں جو کسی دین کو قبول کرکے اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر حاوی کرتے ہیں۔ فطرتِ انسانی کا یہی خاصّہ ہے جو دینِ اسلام کو تاقیامِ قیامت باقی رکھے گا اور صرف اس کے عقائد اور تعلیمات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ پوری انسانیت کو ایک وحدت میں متحد کرسکیں۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ تمام انبیاء کی عمومی تعلیمات پر عمل پیرا ہوکر انفرادی و اجتماعی طور پر کامیابی حاصل کرسکتا ہے، تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو جنّت الحمقاء میں رہ رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس طور پر کسی بھی نبی کی تعلیمات پر عمل نہ کرسکے گا۔ اس صورت میں فیصلہ کن عامل ہر شخص کا اپنا انتخاب اور اپنی رائے ہوگی، اور ہر شخص اپنی مرضی سے انبیاء کی تعلیمات میں چھان پھٹک کرسکے گا۔ اس حکمتِ عملی سے سوائے اس کے کچھ حاصل نہ ہوگا کہ ہر شخص اپنی پسند کے مطابق مذہب کا ایک ایڈیشن تیار کرے اور اس طرح دنیا میں بے شمار متصادم و مخالف مذاہب معرضِ وجود میں آجائیں گے۔ یہ سوچ رکھنے والے افراد کبھی بھی ایک ہم خیال اور متّحد ملت کی شکل اختیار نہیں کرسکتے ـــــ وہ متّحد ملت جو صرف صحیح نصب العین (یعنی خدائے واحد اور خاتم الانبیاء) سے ربط و تعلق کی بنیاد پر قائم کی جاسکتی ہے۔

بالفاظِ دیگر وحدتِ ادیان کے حامی کبھی بھی اپنے فکر کی بنیاد پر "صحیح نصب العین" کو سیاسی طور پر حقیقت کا روپ نہیں دے سکتے۔ اور یہ چیز بجائے خود ان کی کج فکری کی دلیل ہے۔ ایسے لوگ کبھی بھی اپنے تراشیدہ مذہب کی بنیاد پر پوری انسانیت کو متحد کر کے ایک عالمی ریاست کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں سیاسی اور نیم سیاسی مساعی بھی قطعاً مفید نہ ہوں گی اور نہ ہی وہ ان اہداف کا بدل بن سکیں گی جن کے لیے مذہب کو فی الواقع اپنایا جاتا ہے۔

اخلاقیات کے لیے خالقِ کائنات سے محبت شرطِ لازم ہے اور اس محبت کا عملی تقاضا یہ ہے کہ وقت کے نبی کا اتباع کیا جائے۔ فطرتِ انسانی اور خود مختلف انبیاء کی تعلیمات کا بنیادی نکتہ یہی ہے۔ اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں دیگر تمام اصول غیر مؤثر ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ عالمی اخلاقی تحریک جس میں بلاشبہ تمام اقوام کے سرکردہ اور علمی افراد (مرد اور خواتین دونوں) حصّہ لے رہے ہیں اسی حقیقت سے محجوب ہیں۔ ان پر نبی کی تعلیمات پر ایمان لانے کی اہمیت واضح نہیں ہے۔ چنانچہ یہ تحریک عالمی سطح پر اخلاق کے میدان میں ترقی و ترفّع یا اخلاقیات کے عالمی احیائے ثانی میں قطعاً ناکام رہے گی۔

سوال نمبر ۵: اگر یہ مان لیا جائے کہ سلسلۂ نبوّت بالآخر منقطع ہونا ہے، تو پھر ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی آخری نبی کیوں تسلیم کریں؟ کیا حضرت عیسیٰؑ آخری نبی نہیں ہو سکتے؟

جواب: کامل ترین اور ہر اعتبار سے تسلّی بخش نظریۂ حیات وہ ہے جو اسلام ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں جنہوں نے صحیح نصب العین پر مبنی ایک کامل نظریۂ حیات پوری دنیا کو عطا کیا۔ یہ نظریۂ حیات اس اعتبار سے جامع ترین ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے تمام گوشوں یعنی سیاست معیشت، اخلاق، قانون، سماج اور بین الاقوامی تعلقات سب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ تمام برحق انبیاء کی تعلیمات صحیح نصب العین سے محبّت و تعلق پر استوار تھیں لیکن صرف خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں دینی تعلیمات زندگی کے تمام گوشوں میں عملی صورت میں نمایاں ہو کر نظر آتی ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے انسانی تمدّن میں عملی اور اخلاقی اعتبار سے ابھی اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ کوئی نبی ہمیشہ کے لیے

اجتماعیاتِ انسانی کے لیے راہنما اصول فراہم کر دیتا۔ چنانچہ خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تمام انبیاء کی تعلیمات اس اعتبار سے نامکمل تھیں اور ہمیں صرف آپؐ ہی کو سلسلۂ نبوّت کی آخری کڑی تسلیم کرنا ہوگا۔ آپؐ سے پہلے تمام انبیاء مخصوص امتوں کی طرف اور متعین وقت کے لیے بھیجے گئے۔ ان میں کسی کی تعلیمات بھی پوری انسانیت کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نہ تھیں۔

آنحضورؐ کا اُسوہ ـــــ کامل ترین نمونہ

نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف مثالی زندگی بسر کی، بلکہ آپؐ نے مومنین صادقین کی اعلیٰ ترین تربیت کر کے کفر و الحاد کا پوری شدّت اور سرفروشی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اسلامی ریاست کی نہ صرف داغ بیل ڈالی، بلکہ اس کی سربراہی اور انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں بھی ادا کیں، بیرونی دشمنوں اور خطرات سے اس کا دفاع کیا اور اس کے داخلی استحکام کے لیے تمام تدابیر اختیار کیں۔ اسلام کے اصولوں پر مبنی معیشت، معاشرت اور قانون کو عملی شکل دی اور اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کے خدوخال بھی واضح کیے۔ ہر نصب العینی تحریک کی طرح اسلام کے شیدائیوں نے بھی اس کے پھیلاؤ اور پوری دنیا میں اس کے نفوذ کے لیے انتھک مساعی کیں، اور خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں اس عمل کا آغاز فرما دیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کسی نبی نے اپنی عملی مثال سے دین کے تحفّظ اور عالمی استحکام و پھیلاؤ کے لیے اس طرح کی مثال پیش نہیں کی۔

کوئی بھی نظریۂ حیات اپنے آپ کو اسی طرح مشکلات اور موانع سے بچاتا ہے اور اپنا دفاع کرتا ہے جس طرح ایک نامیاتی جسم اپنے آپ کو حالات کی نامساعدت کے باوجود قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی انتہائی اہم عضو معطّل ہو جائے یا گل سڑ جائے، تو اس صورت میں اگرچہ پورا جسم متاثر ہوتا ہے، لیکن اس سے کمتر صورت میں جسم تمام اہم اعضاء کی صحت کے ساتھ اپنے آپ کو برقرار رکھتا ہے چاہے کم وقعت کے اعضاء میں کتنی ہی خرابی کیوں نہ ہو جائے۔ اعضائے رئیسہ کی کارکردگی مختلف خرابیوں کا تدارک کر کے پورے جسم کی صحت اور زندگی کے

احیاء و بقا کا انتظام کرتی ہے۔ بالکل ایسی ہی مثال اس نظریۂ حیات کی ہے جس میں زندگی کے اہم گوشوں کے بارے میں ہدایات نہیں ہوتیں۔ اس نظریۂ حیات کے ماننے والے جوں جوں حیاتِ انسانی کی پیچیدگیوں سے واقف ہوتے ہیں انہیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ان کے نظریۂ حیات یا مذہب میں خامیاں ہیں اور وہ زندگی کے اہم شعبوں میں ان کی راہنمائی سے نہ صرف قاصر ہے بلکہ وہ ان کے فکری و تمدنی ارتقا میں رکاوٹ بنتی ہے۔ ایک ایسا نظریۂ حیات جو آغاز ہی سے اپنی تعلیمات میں مکمل نہ ہو وہ اپنے ماننے والوں کی فکری راہنمائی سے ہی اس قابل نہیں ہو سکتا کہ وہ تمام مسائل کا حل پیش کر سکے۔ ایسی صورت میں اس کے لئے یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ مختلف افراد کی طرف سے پیش کردہ افکار کو اپنے اندر جذب کر کے خود حق اور ناحق کا عجیب و غریب ملغوبہ بن جائے۔ اور جب باطل اور حق کا اس طرح کا بے جوڑ امتزاج ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ حق اپنی افادیت پورے طور پر کھو کر باطل سے علیحدہ کچھ نہیں رہتا۔ حق اس وقت تک ہی حق رہتا ہے جب تک باطل کی آمیزش سے بالکلیہ پاک رہے۔

عیسائیت کی مثال

مذہب عیسائیت کی صورت بالکل وہ ہوئی جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہے۔ اس مذہب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ سیاسیات کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ نہ اس کے اصولوں اور نہ ہی حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سے ریاستی معاملات کے بارے میں کوئی ہدایات ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب جدید دور میں عیسائی ریاستیں معرضِ وجود میں آئیں تو انہیں کچھ علم نہ تھا کہ وہ مذہبی معتقدات اور ریاستی معاملات کو باہم دگر کس طرح مربوط کریں۔ مذہب اور مملکت کے مابین شروع شروع میں طویل اور سخت کشاکش جاری رہی تا آنکہ مذہبی علماء نے بامر مجبوری یہ فیصلہ کیا کہ مذہب اور ریاست دونوں الگ الگ ہیں اور ان میں کوئی ربط و تعلق نہیں۔ یہ بجائے خود ایک غلط نقطۂ نظر تھا جو عیسائیت کی محدود تعلیمات کی بنا پر غلط نصب العین کی خاطر اختیار کیا گیا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ عیسائیت کی بعض اقدار بالکل صحیح تھیں اور ان کا تعلق یقیناً انسانی زندگی میں بہتر ارتقائی عمل سے تھا لیکن ریاست و حکومت کے بارے میں تعلیمات نہ دے کر عیسائیت

نے ثابت کر دیا کہ وہ ابعد میں ظہور پذیر ہونے والے انسانی تمدنوں کے لیے ناقابل عمل ہے جب ایک بار عیسائی علماء نے مذہب کو ریاست سے جدا کر دیا تو اس کا اثر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ وہ بالآخر اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں یعنی اقتصادیات، معیشت، تعلیم، دفاع، قانون بین الاقوامی تعلقات وغیرہ سے خارج کر دیا گیا۔ نتیجۃً مغرب میں عیسائی مذہب کا اثر انفرادی و اجتماعی زندگی پر بالکل ختم ہو کر رہ گیا۔ اور مذہب کے تصور خدا کے بجائے لوگوں کے افکار اور مساعی کا محور نسلی یا علاقائی قوم پرستی بن گیا۔ مذہب کا تعلق صرف عبادت اور کلیسا سے رہ گیا اور عمل کی دنیا میں موثر قوتیں بالکل مادی اور دنیاوی قسم کی ہو گئیں۔ الغرض آج کی دنیا میں عیسائیت اپنے متبعین کی زندگیوں میں ایک موثر عامل کے طور پر قطعاً موجود نہیں ہے۔

لاریب حضرت عیسیٰ سچے نبی تھے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ حق نصب العین کے صرف ایک پہلو (اخلاقی و روحانی پہلو) کو انسانیت کے محض ایک چھوٹے سے حصے یعنی بنی اسرائیل کے لیے اجاگر کرنے آئے تھے۔ مزید برآں آپ کی تعلیمات ایک محدود عرصے کے لیے تھیں۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کا تعلق اجتماعی زندگی کے سیاسی پہلوؤں سے متعلق تھا ہی نہیں اور نہ ہی آپ نے اپنے عمل سے اس طرح کی کوئی راہنمائی فراہم کی۔ مشیت ایزدی کے مطابق یہ چیز ایک مناسب وقت پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری انسانیت کی راہنمائی کے لیے دینا تھیں۔ چنانچہ انگریز پادری مارٹن ڈی۔ آرسی بالکل بجا طور پر اپنی تصنیف "کیمونزم اور عیسائیت" میں رقمطراز ہے:

> "اس حقیقت کا اعادہ بار بار کیا جانا چاہیے کہ عیسائی مذہب کی تاسیس اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی خاص قوم کو خوشحالی حاصل کرنے کے طریقے بتائے۔ یہ فکر دراصل یہودیوں کی غلطی تھی، اور جب لوگوں نے مسیح کو بادشاہ بنانا چاہا تو وہ ان سے بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے"

ماضی قریب میں ایران میں رونما ہونے والا مذہب بہائیت ایسے ہی نامکمل مذہب کی ایک اور مثال ہے۔ چونکہ یہ بھی سیاست اور جنگ و امن کے قوانین سے بحث نہیں کرتا، اس لیے اپنی بنیاد پر کسی ایسے ریاستی اور اجتماعی نظام کو قائم نہیں کر سکتا جو دوسرے مذاہب سے کلیۃً آزاد ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بہائیت دنیا میں زیادہ عرصے تک چلنے والا مذہبی نظریہ حیات نہیں ہے۔

بہائیت کا اصل الاصول دنیا میں امن کا قیام اور انسانوں کو متحد کرنا ہے لیکن اس مذہب کو پیش کرنے والے یہ بھول گئے کہ اکثر اوقات امن کے قیام کے لیے جنگ ضروری ہوتی ہے اور مستقبل میں انسانی اتحاد اس بات کا متقاضی ہوگا کہ وہ اپنے داخلی نظم کو قائم رکھنے کے لیے مخالف قوتوں سے سختی سے نبٹے۔ اور یہ کہ لوگوں کو جدید ریاستوں کے نظام میں رہنا ہوگا جس کے لیے انہیں ہدایات قوانین کی ضرورت ہوگی۔ سیاسی جدّوجہد کی نفی اور مختلف نظاموں کے تحت منفعل انداز میں زندگی بسر کرتے ہوئے اگر وہ بہائی ریاست کے قیام کا خواب دیکھتے ہیں تو یہ سراسر ان کی خام خیالی ہے۔ اگر کسی نظریۂ حیات کے آغاز ہی میں زندگی کے کسی اہم شعبے سے متعلق ہدایات نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ بعد میں آنے والے معتقدین بھی اس کمی کی تلافی نہیں کر سکتے۔ وہ لامحالہ اس نظریۂ حیات کے بانی کی زندگی کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتے ہیں اور اگر انہیں وہاں کوئی روشنی نہ ملے تو زندگی کا وہ گوشہ بنیادی مذہبی تعلیمات سے خالی رہتا ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی مذہب زیادہ لمبے عرصے تک باقی نہیں رہ سکتا۔ مزید برآں بہائی مذہب کا یہ عقیدہ کہ سلسلۂ نبوت جاری ہے اور ہر ہزار سال کے بعد ایک نیا روحانی لیڈر نئی مذہبی جماعت کی تاسیس کرے گا، ان کے اپنے دوسرے عقیدے سے متصادم ہے کہ بہائیت ہمیشہ کے لیے پوری انسانیت کو ایک وحدت میں پرو دے گی۔ بنیادی عقائد میں اس طرح کا تضاد قبول کرنا عقلی طور پر محال ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے تمام مذاہب اور نظریہ ہائے حیات بہت جلد صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔

معزز قارئین کرام!

اپنے زرتعاون کی میعاد جو کہ آپ کے نام/پتہ کے لیبل پر درج ہے ختم یا غلط درج ہونے پر براہِ کرم ہمیں جلد از جلد مطلع فرمادیں کہ آپ کے نام پرچہ بدستور جاری رکھا جائے؟ اس سے ہمیں یہ بھی اطمینان رہے گا کہ پرچہ آپ تک پہنچ رہا ہے اور آپ کا پتہ تبدیل نہیں ہوا ہے۔ اگر آپ زرتعاون بذریعہ وی۔پی۔ پی ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے بروقت تحریر فرمائیں!

شکریہ آپ کے تعاون کے متمنی

مینیجر سرکولیشن

خودی اور رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم

حیاتیاتی تقلیبات کا سلسلہ

لہٰذا حیاتیاتی مرحلۂ ارتقاء میں ایسا ہوتا رہا کہ ہر بار جب خودی نے محسوس کیا کہ اس کی منزلِ مقصود کی طرف اس کی ارتقائی حرکت بعض رکاوٹوں کی وجہ سے حد سے زیادہ سست ہو رہی ہے تو اس نے ایک غیر معمولی کوشش کی اور یکایک گویا ایک جست سے اپنی رکاوٹوں کو عبور کر گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا جسم حیوانی فوری اور معجزانہ طور پر وجود میں آ گیا جو اپنی نوع سے یکسر مختلف تھا اور اپنی ترقی یافتہ جسمانی ساخت کی وجہ سے کامل جسم حیوانی سے قریب تر تھا۔ پھر اس ترقی یافتہ جسم حیوانی کی اولاد سے ایک نئی اور بہتر اور بلند تر نوع حیوانات عالمِ وجود میں آئی۔ حیاتیاتی تقلیبات کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اُن کا مقصد حاصل نہیں ہوا یعنی جب تک کہ وہ کامل جسم حیوانی نمودار نہیں ہوا جو حیاتیاتی ارتقاء کی منزلِ مقصود تھا۔ اور جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو تقلیبات کے ظہور کا سبب (یعنی منزل سے دُور مزاحمت، رکاوٹ اور سُست رفتاری کا سامنا) زائل ہو جانے کی وجہ سے ان کا سلسلہ خود بخود منقطع ہو گیا اور یہ کامل جسم حیوانی آخری نوعِ حیوانی قرار پایا۔ یہی آخری اور کامل جسم حیوانی انسان ہے۔

حیاتیاتی ارتقاء کی شاہراہ

ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت انسان کی اولاد ترقی پا کر تمام انواعِ حیوانات پر غالب آ چکی ہے اور اس کے ذریعہ سے کائنات کا آئندہ ارتقاء جو نظریاتی قسم کا ہے جاری ہے۔ حیاتیاتی ارتقاء کا وہ راستہ جو امیبا سے انسان تک جاتا ہے حیاتیاتی ارتقاء کا سیدھا راستہ یا اس کی شاہراہ ہے جس پر ارتقاء براہِ راست خالقِ کائنات کے مقصد کے مطابق ہوتا رہا۔ اس شاہراہ کی ہر منزل پر جسمِ انسانی کی ایک نئی ترقی یافتہ

صورت ایک جدید نوع حیوانی کی شکل میں ایک تقلیب کے ذریعہ سے وجود میں آتی رہی۔ تاہم اس شاہراہ کی مختلف منزلوں سے ارتقاء کے غلط راستے بھی نکلتے رہے جن پر ارتقاء جاری رہا لیکن تھوڑی دُور آگے جاکر ختم ہوگیا کیوں کہ ارتقاء کی شاہراہ سے ہٹ جانے کی وجہ سے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ارتقاء کی منزلِ مقصود پر پہنچ سکے۔ ارتقاء کی ان گمراہیوں کی وجہ یہ تھی کہ شاہراہِ ارتقاء کی ہر منزل پر انسان کی پست تر اشکال کو جو ابھی حیوانی سطح پر ہی تھیں غلط قسم کا حیاتیاتی ماحول میسر آیا جس کی وجہ سے زندگی یا حیاتیاتی تکمیل کی قوت جو ان کے اندر کام کر رہی تھی اور جو کسی اور راستہ پر کامیاب ہو رہی تھی، موافق حالات نہ پانے کی وجہ سے ایسی سمتوں میں کام کرنے اور ایسی تقلیبات پیدا کرنے لگی جو جسمِ انسانی کی تکمیل کی طرف آگے نہ جاتی تھیں اور جو لہٰذا براہِ راست اس کا مقصود نہ تھیں۔ زندگی کا قاعدہ ہے کہ وہ ناموافق حالات میں بھی اپنی جس قدر ممکنات کو جس قدر زیادہ ظاہر کر سکتی ہے ظاہر کرتی ہے موجودہ دور میں بعض غلط نظر یاتی جماعتوں کی عارضی طاقت اور شان و شوکت زندگی کے اسی قاعدہ کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک تقلیب صحیح راستہ سے ہٹ جائے تو ضروری ہے کہ بعد کی تقلیبات اور بھی صحیح راستہ سے ہٹتی چلی جائیں۔ ریلوے کی کسی برانچ لائن کی طرح کہ وہ مین لائن سے الگ ہوتی ہے تو پھر جس قدر آگے جاتی ہے اس قدر اس سے اور دُور ہوتی چلی جاتی ہے۔

آئندہ کے ارتقاء کی نوعیت

زندگی کا ایک اور قاعدہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی کارروائیوں میں کفایت سے کام لیتی ہے اور اپنے کارآمد حاصلات کو کبھی ضائع نہیں کرتی بلکہ ان سے پورا کام لیتی ہے۔ اس قاعدہ کی وجہ سے زندگی ارتقاء کے عمل میں اپنی جس مخفی استعداد کو ایک بار نمودار کر لیتی ہے اسی کو آئندہ کے ارتقاء کے لیے کام میں لاتی ہے۔ اور درحقیقت وہ اس کو نمودار ہی اس لیے کرتی ہے کہ اسے آئندہ کے ارتقاء کی اسکیم میں اس سے کام لینا ہوتا ہے۔ کروڑوں برس کے حیاتیاتی ارتقاء کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حیوانِ کامل یا انسان وجود میں آگیا ہے جو نہ صرف حیاتیاتی نقطۂ نظر سے کامل ہے بلکہ جس کے اندر حیاتیاتی تکمیل کی وجہ سے ایک نئی استعداد یعنی خدا کی محبّت کا ایک طاقت ور جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ لہٰذا زندگی کے اس قاعدہ کے مطابق ضروری ہے کہ انسان کے بعد کا سارا ارتقاء انسان ہی کے راستہ سے ہو اور

اس کا دارومدار انسان کی اس استعداد کے اظہار پر ہو۔ دوسرے لفظوں میں اب کائنات کے ارتقاء کا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان اپنی عملی زندگی میں خدا کی محبت کے جذبہ کو کس حد تک مطمئن کرتا ہے۔ چونکہ جولین ہکسلے (Julian Huxley) خدا کے عقیدہ سے ناآشنا ہے اور فطرت انسانی میں نظریات اور اقدار کے منبع کو نہیں جانتا۔ وہ اس حقیقت کا اظہار اس طرح سے کرتا ہے: "انسان کے وجود میں آنے کے بعد ارتقاء کی نوعیت یکلخت بدل جاتی ہے۔ انسانی شعور کے ساتھ اقدار و نظریات پہلی دفعہ زمین پر ظہور پذیر ہوئے۔ لہٰذا مزید ارتقاء کا معیار یہ ہے کہ یہ نظریاتی اقدار کس حد تک مطمئن ہوتی ہیں۔" چونکہ خدا کی محبت کا جذبہ جو صحیح نظریۂ حیات کی بنیاد بنتا ہے وہی بہک کر غلط نظریات بھی پیدا کرتا ہے ظاہر ہے کہ نوع انسانی کے تمام نظریات اسی جذبہ کی پیداوار ہیں اور اسی کو مطمئن کرنے کی کامیاب یا ناکام کوششیں ہیں۔

زندگی شرح اشارات خودی است
لا و الا از مقاماتِ خودی است

حیاتیاتی اور نظریاتی ارتقاء کی مماثلت

چونکہ زندگی ایک ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے لہٰذا خواہ وہ حیاتیاتی سطح ارتقاء پر سرگرم عمل ہو یا نظریاتی سطح ارتقاء پر اس کے بڑے سے بڑے اوصاف و خواص کے اظہار میں کوئی بنیادی فرق نہیں آتا۔ مثلاً اگر زندگی حیاتیاتی سطح پر نشوونما کرتی ہے تو نظریاتی سطح پر بھی نشوونما کرتی ہے۔ اگر حیاتیاتی سطح ارتقاء پر جسم حیوانی کی صورت میں ایک کُل یا وحدت کی تشکیل کرتی ہے تو نظریاتی سطح ارتقاء پر بھی انسانی شخصیت کی صورت میں ایک کُل یا وحدت کی تشکیل کرتی ہے۔ اگر حیاتیاتی سطح پر ایک جسم حیوانی ایک خاص مادی شکل رکھتا ہے جو اس کے اعضاء و جوارح کی ساخت سے صورت پذیر ہوتی ہے تو نظریاتی سطح پر انسانی شخصیت بھی ایک خاص نظریاتی شکل رکھتی ہے جو اس کے نصب العین کی صفات سے پیدا ہونے والے اعتقادات و تصورات، اخلاق و اعمال، عادات و شمائل اور افکار و آراء سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ اگر جسم حیوانی پروٹین اور فلزات کی صورت میں مادی غذا جذب کر کے نشوونما پاتا ہے تو شخصیتِ انسانی بھی نصب العین کی صفات کے حسن کی صورت میں نفسیاتی غذا جذب کر کے نشوونما

پاتی ہے۔ اگر جسم حیوانی نشوونما پاکر فرد کے والدین کے جسمانی نمونہ کے مطابق بن جاتا ہے تو شخصیتِ انسانی بھی نشوونما پاکر فرد کے والدین کے نظریاتی نمونہ کے مطابق بن جاتی ہے۔ اگر حیاتیاتی سطح پر ایک جسم حیوانی عمل توالد کے ذریعہ سے اپنی شکل کے اور بہت سے حیوانات پیدا کرکے اپنی مخصوص نوعِ حیوانی کو وجود میں لاتا ہے تو نظریاتی سطح پر ایک انسانی شخصیت بھی ایک قسم کے نظریاتی توالد کے ذریعہ سے اپنی ہی نظریاتی شکل کی اور بہت سی شخصیتیں پیدا کرکے اپنی مخصوص نظریاتی جماعت کو وجود میں لاتی ہے۔ اگر زندگی کی خصوصیات کی وجہ سے ضروری تھا کہ انواعِ حیوانات ایک ایسی نوعِ حیوانات کی سمت میں ارتقا کرتی رہیں جو حیاتیاتی طور پر کامل ہو یعنی نوعِ انسانی کی سمت میں، تو ان ہی خصوصیات کی وجہ سے یہ بھی ضروری تھا کہ نظریاتی جماعتیں بھی ایک ایسی نظریاتی جماعت کی طرف ارتقا کرتی رہیں جو نظریاتی طور پر کامل ہو۔ یہ نظریاتی جماعت رحمۃ للعلمین کی اُمت ہے۔ جس طرح سے ضروری تھا کہ پہلے انسان کے ظہور کے بعد جنگلوں کے دوسرے خونخوار حیوانات کے بالمقابل انسان کی ظاہری ناتوانی کے باوجود انسان کی نسل دنیا میں پھیل جائے، اسی طرح ضروری ہے کہ رحمۃ للعلمین کے ظہور کے بعد ان کی روحانی اولاد یعنی مسلمان قوم دوسری قوموں کے بالمقابل اپنی موجودہ ظاہری کمزوری کے باوجود آخر کار دنیا میں پھیل جائے۔ جس طرح سے نوعِ انسانی کے ظہور کے بعد بھی حیاتیاتی ارتقا غلط راستوں پر جاری رہا اور دیر تک انسان سے کم تر درجہ کی انواعِ حیوانات وجود میں آتی رہیں، اسی طرح سے رحمۃ للعلمین کی اُمت کے ظہور کے بعد نظریاتی ارتقا بھی غلط راستوں پر جاری ہے اور نظریاتی اعتبار سے اُمتِ مسلمہ سے کمتر درجہ کی نظریاتی جماعتیں وجود میں آرہی ہیں لیکن جس طرح سے ضروری تھا کہ نوعِ انسانی دوسری تمام انواعِ حیوانات پر جو انسان کے ظہور سے پہلے اور بعد نمودار ہوتی تھیں مکمل طور پر غالب آتے، اسی طرح سے ضروری ہے کہ رحمۃ للعلمین کی اُمت بھی تمام نظریاتی جماعتوں پر جو رحمۃ للعلمین کے ظہور سے پہلے اور بعد نمودار ہوتی ہیں مکمل طور پر غالب آئے۔ قرآن حکیم نے زوردار الفاظ میں اس غلبہ کی پیشگوئی کی ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (التوبۃ: ۳۳، الصف: ۹)

خدا وہ ذاتِ پاک ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے نظریۂ حیات کے ساتھ بھیجا تاکہ

اسے تمام دوسرے نظریات پر غالب کر دے خواہ مشرکین اس بات کو ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔

نظریاتی ارتقاء کا نقطۂ آغاز

نظریاتی مرحلۂ ارتقاء پہلے مکمل جسم حیوانی یا پہلے انسان سے شروع ہوا تھا جو حیاتیاتی طور پر مکمل ہو جانے کی وجہ سے اس قابل ہو گیا تھا کہ اس میں خدا کی محبت کا ایک طاقت ور جذبہ اس کی تمام جبلتی خواہشات کی حکمران قوت کی حیثیت سے پیدا ہو۔ جس طرح سب سے پہلے جاندار یعنی ایک خلیہ کے حیوان امیبا کے ظہور کے بعد ضروری تھا کہ ارتقاء کلیتہً حیاتیاتی ہوتا، اسی طرح سب سے پہلے انسان کے ظہور کے بعد ضروری تھا کہ ارتقاء کلیتہً نظریاتی ہوتا۔ سب سے پہلے انسان کو نہ صرف خدا نے حسن کی محبت کا جذبہ عطا کیا، بلکہ اس کو نبوت بھی عطا کی یعنی اپنی خاص رحمت سے وحی کے ذریعہ سے اس کو اور اس کی اولاد کو اس جذبۂ محبت کی تسکین اور تشفی کی راہ نمائی بھی عطا کی اور بتایا کہ وہ خدا کی محبت اور عبادت سے مکمل اور مستقل طور پر مطمئن ہو سکتا ہے۔ قدرت کوئی ضرورت پیدا نہیں کرتی جس کی تکمیل کا اہتمام خود نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت کی پیدا کی ہوئی ہر ضرورت ارتقاء کے کسی مقصد کو پورا کرتی ہے اور اگر قدرت اس ضرورت کی تکمیل کا اہتمام نہ کرے تو اس ضرورت کو پیدا کرنے کا کوئی فائدہ یا مقصد ہی نہ ہو۔ اور اگر ارتقاء کا دارومدار اس ضرورت کی تکمیل پر رکھا گیا ہو تو ارتقاء بھی جاری نہ رہ سکے۔ یہی سبب ہے کہ سب سے پہلے انسان جن کو حضرت آدمؑ کہا جاتا ہے خدا کے نبی تھے۔ چونکہ انسان از خود اپنے جذبۂ محبت کے مقصود کو نہیں جان سکتا اور جذبۂ محبت نہایت آسانی سے بہک جاتا ہے لہٰذا اگر وہ نبی نہ ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ خدا نے سب سے پہلے انسان کے دل میں اپنی محبت کا جذبہ تو پیدا کیا لیکن اس کی راہ نمائی نہیں کی، بلکہ اس کو سرگردان اور بے راہرو ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ ایسا ہونا خدا کی رحمت اور ربوبیت کے ان تقاضوں سے ہی بعید ہوتا جن کے ماتحت اس نے انسان کو اپنی محبت کا جذبہ عطا کیا تھا۔ نبی کی تعریف ہی یہ ہے کہ نبی وہ شخص ہوتا ہے جو اپنی جد وجہد اور کوشش سے نہیں بلکہ خدا کی خاص رحمت سے اور براہ راست خدا سے وحی پا کر اس بات کا علم حاصل کرتا ہے کہ انسان کی محبت کا مقصود فقط خدا ہے اور انسان خدا کی محبت کے فطری جذبہ کو عملی طور پر خدا کی عبادت

اور اطاعت سے مطمئن کر سکتا ہے اور اپنی قوم کے دوسرے افراد کو اس علم سے مستفید کرتا ہے۔

نبیِّ کامل ۔ نظریاتی ارتقاء کا مقصود

یہ بات آشکار ہے کہ حضرت آدم اور ان کی امّت کا نظریۂ حیات (اور ظاہر ہے کہ ان کی امّت ان کی اولاد کے ایک حصّہ پر ہی مشتمل ہوگی) نہایت سادہ ہوگا۔ اس وقت ہمیں معلوم ہے کہ انسان کی قدرتی عملی زندگی کے ضروری تقاضوں میں سیاست، عبادت، اخلاق، تعلیم، قانون، صنعت و حرفت، تجارت، سماجی اور خاندانی تعلقات اور جنگ وغیرہ شامل ہیں لیکن حضرت آدمؑ کے زمانہ میں جب انسان کی زندگی کے کاروبار کا دارومدار زیادہ تر سیر و شکار پر ہوگا، انسان کی قدرتی عملی زندگی کے چند ضروری تقاضے بھی آشکار نہیں ہوئے ہوں گے، لہٰذا خدا کی محبت کے بنیادی اصولِ حیات کو سوسائٹی کی اس وقت کی عملی زندگی پر چسپاں کرنے سے جو نظریۂ حیات وجود میں آیا ہوگا وہ سوائے اس کے کہ خدا کی عبادت اور چند اخلاقی اصولوں کی پابندی پر مشتمل ہو اور کیا ہو سکتا ہے۔ تاہم جُوں جُوں انسان کی قدرتی عملی زندگی کے ضروری تقاضے اُبھرتے گئے ان پر خدا کی محبت کے اصُول کا اطلاق کرنے کے لیے نئے نئے انبیاء پیدا ہوتے رہے اور ان کی روحانی اولاد سے نئی نئی امّتیں وجود میں آتی رہیں اور ان کی عملی اور نظری تعلیم سے خدا کے عقیدہ پر مبنی نئے نئے نظریات پیدا ہوتے رہے جو انسان کے تمدنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اپنی وسعت اور تفصیل میں بتدریج ترقی کرتے رہے۔ ایک روایت کے مطابق انبیاء کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترقی پذیر انواعِ حیوانات کی طرح یہ نت نئی پیدا ہونے والی ترقی پذیر امّتیں بھی اپنے نظریات کے سمیت کسی منزلِ مقصود کی طرف آگے بڑھ رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ نظریاتی مرحلۂ ارتقاء میں خودی کی منزلِ مقصود یہ تھی کہ وہ ایک کامل نبی پیدا کرے جو اپنی عملی زندگی کی مثال سے ایسا نظریۂ حیات وجود میں لائے جو خدا کی محبت کے اصول کو انسان کی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں مثلاً سیاست، عبادت، اخلاق، تعلیم، قانون، صنعت و حرفت، تجارت، سماجی اور خاندانی تعلقات اور جنگ وغیرہ پر چسپاں کرے اور لہٰذا ایک کامل نظریۂ حیات ہو اور پھر اس کامل نبی کی روحانی اولاد یا امّت کو ترقی دے کر رُوئے زمین پر پھیلائے اور تمام نظریاتی جماعتوں پر غالب کر دے تاکہ وہ دوسری

(باقی ص۱۳ پر)

سورۃ البقرۃ (۱۱)

> ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی پر اُلٹی بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورت کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ بحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم — وھکذا۔

۲ : ۱۱ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا
خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ
اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۴ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ
بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۵

۲ : ۱۱ : ۱ اللغۃ

[وَاِذَا] پر ابھی اوپر البقرہ : ۱ [۲ : ۹ : ۱ (۱)] میں بات ہو چکی ہے

۲:۱۱:۱ (۱) [لَقُوْا] کا مادہ " ل ق ی " اور وزن اصلی " فَعِلُوْا " ہے ۔ اس کی شکل اصلی " لَقِیُوْا " تھی ۔ ناقص کے قاعدے کے تحت واوالجمع سے ماقبل آنے والا لام کلمہ (ی) گر گیا اور اس سے ماقبل (عین کلمہ یعنی ق) چونکہ مکسور تھا لہٰذا وہ مضموم ہو گیا اور یوں اب یہ لفظ بصورت " لقوا " مستعمل ہے ۔ اس مادہ (لقی) سے فعل ثلاثی مجرد لَقِیَ ..... یَلْقٰی لِقَاءً (باب سمع سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی تو ہیں " کسی کے سامنے آجانے پر (پہلے سے طے کئے بغیر) اس سے ملاقات ہو جانا " اس کا عام اردو ترجمہ " ..... سے ملنا ، ..... سے ملاقات کرنا " ہے ۔ اور حسب موقع یہ " ..... کے سامنے آجانا ، پیش آنا اور ..... کو پانا " کے معنی بھی دیتا ہے اور پھر اس سے اس میں " ..... کے مقابلے پر آنا ، ..... کو مقابلے پر پانا ، ..... کا سامنا کرنا ، ..... سے مقابلہ ہونا ، ..... کو سامنے پانا یا دیکھ لینا ، ..... سے تکلیف اٹھانا " کے معنی پیدا ہوتے ہیں ۔ اور یہ فعل حسی اور معنوی دونوں طرح کی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔

● یہ فعل بنیادی طور پر متعدی ہے اور اس کا مفعول ہمیشہ بنفسہٖ (بغیر صلہ کے) آتا ہے مثلاً " لقیا غلامًا " (الکھف : ۷۴) اور " اذا لقیتم فئۃً " (الانفال : ۴۵) میں " غلامًا " اور " فئۃ " علی الترتیب مفعول بہٖ ہیں ۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد کے مختلف صیغے ۱۵ کے قریب مقامات پر آئے ہیں ۔ جن میں یہ فعل اپنے تمام بنیادی اور ثانوی معنوں کے ساتھ استعمال ہوا ہے ۔ مجرد کے علاوہ مزید فیہ کے ابواب افعال ، تفعیل ، تفعل ، تفاعل ، مفاعلہ اور افتعال سے بھی مختلف افعال اور اسماء مشتقہ اور مصادر ۱۳۰ سے زائد مقامات پر وارد ہوئے ہیں ۔ ان سب پر حسبِ موقع بات ہوگی ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ۔

زیرِ مطالعہ کلمہ " لقوا " اس فعل مجرد سے فعل ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے اور اس کا ترجمہ " اذا " شرطیہ کے بعد آنے کی وجہ سے فعل حال میں کیا جائے گا اگرچہ بعض نے فعل مضارع کے ساتھ بھی ترجمہ کیا ہے یعنی " اذا لقوا "

جب وہ ملتے ہیں یا جب وہ ملیں "۔
[اَلَّذِیْنَ] اسم موصول [دیکھئے ۱:۶:۱(۱)] بمعنی " وہ سب جو کہ "
[اٰمَنُوْا] کا مادہ " ا م ن " اور وزن " اَفْعَلُوْا " ہے جو دراصل " أَأْمَنُوا " تھا پھر مہموز کے قاعدۂ تخفیف کے ماتحت " آمنوا " بنا۔ یہ اس مادہ سے بابِ اِفعال کا فعل ماضی معروف (صیغہ جمع مذکر غائب) ہے۔ اس کے بابِ افعال کے معنی وغیرہ پر پہلے بات ہو چکی ہے [۲:۲:۱(۱) میں]۔ یہاں "آمنوا" کے معنی تو ہیں " وہ ایمان لائے "۔ تاہم کس پر ایمان لائے ؟ کا جواب ۔۔ یعنی فعل کا مفعول ۔۔ مذکور نہیں ہوا۔ جو " ایمان " کے اصطلاحی معنوں کی وجہ سے خود بخود سمجھا جاتا ہے۔ لفظ " ایمان " جب مطلقاً بولا جائے تو اس سے کن امور پر ایمان لانا مراد ہوتا ہے ؟ ۔ اس کا کچھ ذکر تو اسی سورۃ (البقرہ) کی ابتدائی آیات (۳، ۴) میں گزرا ہے۔ آگے چل کر بھی قرآن کریم میں متعدد جگہ " ایمان " کے معنی و مطلب کا بیان آئیگا۔
[قَالُوْا] کا مادہ " ق و ل " وزن اصلی " فَعَلُوْا " ہے۔ شکلِ اصلی " قَوَلُوْا " تھی جس میں واو متحرکہ اپنے ماقبل کے مفتوح ہونے کے باعث " الف " میں بدل گئی۔ اس مادہ کے فعل ثلاثی مجرد قال یقول قولاً (کہنا) پر بات ہو چکی ہے [۲ : ۷ : ۱(۵) میں]
[آمَنَّا] کا مادہ " ا م ن " اور وزن اصلی " اَفْعَلْنَا " ہے۔ یہ بھی (مندرجہ بالا " آمنوا " کی طرح) اس مادہ سے بابِ افعال کا فعل ماضی (صیغہ جمع متکلم) ہے۔ اس کا ترجمہ ہے " ہم ایمان لے آئے "۔ یہاں بھی کس پر ؟ کا ذکر نہیں کیا گیا ۔ اور یہاں بھی لفظ " ایمان " کا مطلق استعمال اس کے اصطلاحی شرعی معنوں کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

<u>۲:۱۱:۱(۲)</u> [وَاِذَا خَلَوْا] کے " واذا " کے معنی و استعمال کی تفصیل کے لیے دیکھئے البقرہ : ۱۲ یعنی " <u>۲:۹:۱(۱)</u> " ۔ اور " خَلَوْا " کا مادہ " خ ل و " اور وزن اصلی " فَعَلُوْا " ہے۔ اس کی اصلی شکل " خَلَوُوْا " تھی۔

جس میں واو الجمع سے ماقبل دال لام کلمہ (د) گر گیا اور اس کے ماقبل عین کلمہ (ل) کی فتحہ (ے) برقرار رہی۔ یوں یہ لفظ " خَلَوْا " بن گیا جس کا وزن اب "فَعَوْا" رہ گیا ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " خلا یَخلُو خلاءً و خُلُوّاً (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں " خالی ہونا " (یعنی اندر کی ساری چیز کا نکل جانا)۔ اسی سے اس میں کسی چیز یا وقت وغیرہ کے لیے " گزر جانا " کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ فعل لازم ہے اور ان معنوں کے لیے اس کے ساتھ کوئی صلہ استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں یہ زیادہ تر (بیش سے زائد جگہ) اسی طرح (بغیر صلہ) استعمال ہوا ہے ـــــ پھر " خالی ہونا " سے ہی اس میں " اکیلا ہونا " اور " علیحدگی میں ہونا " کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

● اس فعل کے ساتھ مختلف صلات (مثلاً " ب " ، عن ، من ، علی ، الی ، مع) مل کر اسے مزید مختلف معنی دیتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں یہ صرف " الیٰ " کے صلہ کے ساتھ ہی آیا ہے اور وہ بھی صرف دو جگہ (اسی سورۃ ـــ البقرہ کی آیت ۱۴ اور ۷۶ میں) اور " خلا الی ..... " کے معنی ہیں :..... کے پاس اکیلے ہونا ، اکیلے جانا ، تنہا ہونا ، خلوت میں پہنچنا یا ..... کے ساتھ اکیلے ہونا " گویا " الی " بمعنی مع (برائے معیت) آتا ہے۔ اردو کے اکثر مترجمین نے یہاں اس فعل کا ترجمہ مندرجہ بالا مصدری معنی کے ساتھ کیا ہے۔ کلمہ "خَلَوْا" اس فعل (خلا یخلو) سے فعل ماضی معروف کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔

۲:۱۱:۱ (۳) [اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ] اس میں " الی " تو گزشتہ فعل (خلوا) کا صلہ ہے۔ جس کے معنی ابھی اوپر بیان ہوئے ہیں۔ یہ (الی) مختلف معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ حسب موقع "..... تک (یعنی کسی وقت تک یا کسی جگہ تک) ، ..... کے پاس ، ..... کے نزدیک ، ..... کے لیے ..... کے ساتھ " سے کیا جا سکتا ہے ـــ اور کلمہ " شیاطین " (جو یہاں ضمیر " ھم " کی طرف مضاف ہے) لفظ " شیطان " کی جمع ہے۔ اس کے

مادہ اور اس کے معانی پر " استعاذہ " کی بحث میں بات ہوئی تھی۔ یعنی اس کا مادہ " ش ط ن " بھی ہو سکتا ہے اور " ش ی ط " بھی ۔ اور اس طرح اس لفظ (شیطان) کا وزن پہلی صورت میں " فَیْعال " اور دوسری صورت میں " فَعْلانٌ " ہوگا۔ اس طرح لفظ " شیاطین " (بصورت جمع) کا وزن (شطن سے " فیاعیل " اور (شیط سے) " فعالین " بنتا ہے لیکن یہ دونوں وزن جمع مکسر کے معروف اوزان میں سے نہیں ہیں۔ اس لیے ان کو " شبہ فعائل یا شبہ مفاعیل " وزن کہا جاتا ہے جو منتہی الجموع کے ایک وزن " فعالیل " کا ہم وزن ہے۔

● اور یہاں وزن سے مراد (ف ع ل پر مبنی) صرفی وزن نہیں ہے۔ بلکہ صرف حروف کی تعداد اور حرکات کی ترتیب کے لحاظ سے مشابہ و مماثل ہونا مراد ہے۔ اس لحاظ سے فعالیل، فیاعیل یا فعالین سب مماثل " مفاعیل " ہیں۔ اس طرح " سلاطین، مصابیح، تصاویر وغیرہ کو " شبہ مفاعیل " جمع مکسر کہتے ہیں۔

● کلمہ " شیاطین " بھی اس طرح کی جمع ہے۔ اور منتہی الجموع سے مشابہت کی بنا پر یہ غیر منصرف (جمع) ہے۔ یہاں اس کے آخر پر کسرہ (ـِ) آگے مضاف ہونے کی وجہ سے آیا ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک " شیاطین " اپنے واحد " شیطان " کی جمع مذکر سالم (شَیْطَانُوْنَ) کی ایک غیر قیاسی صورت ہے۔ کیونکہ بعض شاذ صورتوں میں اس کی جمع شَیاطون (مرفوع) اور شیاطین (منصوب یا مجرور) استعمال ہوئی۔

● لفظ " شیطان " کے مختلف معانی اور استعمالات (جو بحث استعاذہ میں گزر چکے ہیں) کو سامنے رکھتے ہوئے بعض حضرات نے یہاں (آیت زیر مطالعہ میں) " شیاطین " کا ترجمہ " سرداروں " یا " شریر سرداروں " کیا ہے۔ اور بعض مترجمین نے مزید وضاحت کو وظیفۂ مفسّر سمجھتے ہوئے، اس کا ترجمہ " شیطانوں " ہی رہنے دیا ہے جو اردو محاورہ میں مستعمل لفظ ہے۔

۲ : ۱۱ : ۱ (۴) [قَالُوا اِنَّا مَعَکُم] جو قالوا + اِنَّ + نَا + مَعَ + کُم سے مل کر بنا ہے ۔ اس میں لفظ " قالوا " کے مادہ اور وزن پر اسی آیت میں (اوپر) اور اس کے معنی و استعمال پر ۲:۷:۱(۵) میں بات ہو چکی ہے ۔ یہاں بھی اس کا ترجمہ " اذا " شرطیہ کے جواب میں آنے کی وجہ سے حال یا مستقبل میں ہوگا ۔ یعنی " تو کہتے ہیں " کی صورت میں ۔ " اِنَّا " دراصل اِنَّ (حرف مشبہ بالفعل) + نَا (ضمیر متکلم منصوب) کی دوسری شکل ہے ۔ اور اس کے معنی " بے شک ہم " کے ہیں جس کا ترجمہ " یقیناً ہم تو " بھی ہو سکتا ہے ۔

● اور لفظ " مَعَ " (جس کا عام اردو ترجمہ "..... کے ساتھ " ہے) اکثر اہل لغت کے نزدیک یہ ایک اسم ہے کیونکہ کبھی کبھی یہ حال ہو کر تنوین کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جیسے معاً (یکجا ۔ اکٹھے ہوتے ہوئے) ۔ اگرچہ اس کا یہ استعمال قرآن کریم میں نہیں آیا ـــــ بعض نحویوں کے نزدیک یہ ایک حرف ہے جو جہاتِ ستہ (فوقَ، تحتَ، خلفَ، اَمامَ، یمین اور یسار) کی طرح ظرف کے طور پر ہمیشہ مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے ۔ اور اس کا ظرفِ زمان یا ظرف مکان ہونا اس کے مضاف الیہ سے معلوم ہوتا ہے ۔ مثلاً " مع زید " میں مکان کا مفہوم موجود ہے اور " مع الفجر " میں زمان کا ۔

● اور بعض دفعہ مکان یا زمان سے قطع نظر صرف " ساتھی، حامی اور مددگار " کے معنی میں بھی آتا ہے ۔ اس وقت اس کا مضاف الیہ اس چیز کو (جو عموماً کوئی شخص یا جماعت ہوتی ہے) ظاہر کرتا ہے جس کی مدد کی جا رہی ہو اور جس کا ساتھ دیا جا رہا ہو ۔ خصوصاً جہاں اللہ تعالیٰ کی معیّت کا ذکر ہو جیسے " اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا " اور " اِنَّ رَبِّیْ مَعِیَ " میں ہے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو زمان و مکان سے ماوراء ہے ـــ ویسے بعض دفعہ عبارت کا سیاق و سباق بھی یہ مفہوم پیدا کر دیتا ہے ۔ مثلاً اسی (زیر مطالعہ) عبارت " اِنّا معکم " میں محض کسی وقت یا جگہ پر اجتماع (اکٹھا ہونا) کی بجائے " یار اور مددگار " ہونے کا مفہوم موجود ہے ۔ تاہم اردو محاورہ میں " کسی کے

ساتھ ہوتا" میں بھی حسبِ موقع "کسی کا ساتھ دینا" کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اردو مترجمین نے "مَعَکُم" کا ترجمہ "تمہارے ساتھ ہیں" کیا ہے جو لفظ سے بھی قریب تر ہے۔ البتہ "اِنَّا" کا ترجمہ بعض نے "بے شک ہم" بلاشبہ ہم" سے کیا ہے اور بعض نے "ہم تو" کیا ہے جو محاورے کے اعتبار سے درست ہے مگر جن حضرات نے صرف "ہم" سے ترجمہ کیا ہے وہ عبارت سے دور ہے کیونکہ وہ محض "نَحْنُ" کا ترجمہ ہے اس میں "اِنَّ" والی تاکید مفقود ہے۔

۲:۱۱:۱ (۵) [**اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ**] "اِنَّمَا" کے معنی اور استعمال پر ابھی البقرہ: ۱۱ [۲:۹:۱(۵) میں] بات ہو چکی ہے۔ "نَحْنُ" (ہم) معروف ہے۔ "مُسْتَهْزِءُوْنَ" کا مادہ "ھ ز ء" اور وزن "مُسْتَفْعِلُوْنَ" ہے۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "هَزَأَ يَهْزَأُ هَزْءًا (باب فتح سے) اور هَزِئَ يَهْزَأُ هُزُءًا یا هُزْءًا (باب سمع سے)" "بِ" یا "مِنْ" کے صلہ کے ساتھ آتا ہے یعنی "هَزَأَ یا هَزِئَ مِنْ ..... وَبِ....." اور اس کے معنی ہوتے ہیں ".....سے ہنسی کرنا، .....کو بنانا، .....سے دل لگی کرنا" اور بعض اہلِ لغت کے نزدیک باب سمع سے آئے تو اس کے ساتھ "باء (بِ)" کا صلہ آتا ہے "مِن" کا نہیں۔ یعنی "هَزِئَ بِه" کہیں گے هَزِئَ منه کہنا درست نہیں ہے[1]

تاہم اکثر کتبِ لغت میں یہ تمیز روا نہیں رکھی گئی بلکہ دونوں ابواب سے دونوں صلات کے ساتھ ایک ہی معنی بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ فعل کسی بھی صلہ کے بغیر بھی مختلف معانی کے لیے (ان ہی دو ابواب سے) استعمال ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس فعل (ثلاثی مجرد) کا کوئی صیغہ کسی طرح استعمال نہیں ہوا۔ البتہ اس کا مصدر "هُزُءٌ" (بصورت "هُزُوٌ") قرآن کریم میں گیارہ جگہ آیا ہے۔

زیرِ مطالعہ کلمہ "مُسْتَهْزِءُوْن" اس مادہ (ھزء) سے باب استفعال کا

---

[1] مدّ القاموس (LANE) تحت مادہ ھزء

صیغۂ اسم الفاعل (جمع مذکر سالم) ہے۔
اور بابِ استفعال سے فعل " استھزأ یستھزئُ استھزاءً " بھی ہمیشہ " بِ " کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے یعنی " استھزأ بہ " کہتے ہیں۔ (" استھزأہٗ " یا " استھزأ منہ " کہنا غلط ہے) ۔ معنی کے لحاظ سے یہ (باب استفعال کا فعل) " ھَزِئَ " (ثلاثی مجرد) کے مترادف اور ہم معنی ہے۔ اس کا مصدر " استھزاء " اردو میں بھی متعارف اور مستعمل ہے۔ اس طرح اس اسم الفاعل (مستھزءون) کا اردو ترجمہ " استہزاء کرنے والے "، ٹھٹھا کرنے والے، ہنسی کرنے والے، یا " بنانے والے " ہونا چاہیئے۔ تاہم اردو کے قریباً تمام ہی مترجمین نے (غالباً اردو محاورہ کا لحاظ رکھتے ہوئے) " مستھزءون " کا ترجمہ فعل مضارع " نستھزئُ " کی طرح کر دیا ہے یعنی " ہم ٹھٹھا کرتے ہیں، ہنسی کرتے ہیں، استہزاء کرتے ہیں، بناتے ہیں، دل لگی کرتے ہیں "۔ کی صورت میں ـــ بلکہ بعض نے تو بصورت فعل ماضی یعنی " ہم بنا رہے تھے " سے ترجمہ کر دیا ہے۔ اس طرح بعض حضرات نے اس کے ساتھ مفعول کا اضافہ کر کے ترجمہ کر دیا ہے (یعنی ' مسلمانوں سے '، ' مسلمانوں کو ' یا " ان کے ساتھ " کا اضافہ کر کے) اسے اپنے مفہوم کے لحاظ سے توضیحی یا تفسیری ترجمہ تو کہہ سکتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ قرآن کریم کی اصل عبارت سے ذرا ہٹ کر ہے۔

[اللّٰہ] کے مادہ و اشتقاق وغیرہ کی بحث سورۃ الفاتحہ [۱ : ۱ : (۲)] میں گزر چکی ہے۔

[یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ] میں فعل " یستھزئُ " کا مادہ " ھ ز ء " اور وزن " یَسْتَفْعِلُ " ہے۔ یعنی یہاں یہ فعل اپنے مادہ سے باب استفعال کے فعل مضارع کا صیغۂ واحد مذکر غائب ہے۔ اور " بِھِمْ " کی " بِ " اس فعل کے صلہ کے طور پر آئی ہے۔ اس فعل کے اس صلہ کے ساتھ استعمال (استھزأ بِ .....) اور اس کے معنی پر ابھی اوپر بات ہوئی ہے اس طرح " یستھزئُ بھم " کا ترجمہ ہوگا: " وہ ان سے ٹھٹھا کرتا ہے، ان کا مذاق اڑاتا ہے، استہزاء کرتا ہے " وغیرہ۔

۲:۱۱:۱(۶) [وَ یَمُدُّھُمْ] میں " وَ " تو عاطفہ بمعنیٰ " اور " ہے۔ اور فعل " یَمُدُّ " کا مادہ " م د د " اور وزن اصلی " یَفْعُلُ " ہے اور اس کی اصلی شکل تو " یَمْدُدُ " تھی۔ پھر مضاعف کے قاعدے کے مطابق درمیانی " دُ " کا ضمہ (ـُ) اس کے ماقبل ساکن " م " کو دے کر " یَمُدْدُ " اور پھر ادغام ہوکر " یَمُدُّ " بنا۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " مَدَّ ..... یَمُدُّ مَدًّا (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی "..... کو لمبا کرنا، ..... کو دراز کرنا، پھیلانا یا کھینچنا" کے ہوتے ہیں۔ اور اس کا مفعول (جو ہمیشہ بنفسہٖ آتا ہے) " حَبْلٌ " (رسی)، " بصر " (نظر یا نگاہ)، " صوت " (آواز) اور " عمر " (زندگی) ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ فعل متعدی ہی استعمال ہوتا ہے۔ بعض دفعہ یہ بطور فعل لازم (طویل ہونا، پھیلنا یا بڑھنا کے معنی ہیں) بھی آتا ہے۔ مثلاً اگر " النھار " (دن) یا " البحرُ " (سمندر) فاعل ہو تو ۔ تاہم قرآن کریم میں یہ بطور فعل لازم کہیں استعمال نہیں ہوا ۔ اور بطور فعل متعدی اس کے مذکورہ بالا معنوں سے ہی اس میں " ...... کو ڈھیل دینا، مہلت دینا، بڑھا دینا یا ترقی دینا " کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ کہ اس آیت میں بیشتر مترجمین نے " وَ یَمُدُّھُمْ " کا ترجمہ " اور وہ ان کو ڈھیل دیتا ہے " اور " ڈھیل دیتے چلا جاتا ہے " کے ساتھ کیا ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد کے مختلف صیغے ۱۲ جگہ وارد ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے صرف باب افعال سے کچھ صیغے اور بعض مصدر اور مشتق اسماء ۱۸ جگہ آئے ہیں۔ ان سب پر انشاء اللہ اپنے اپنے موقع پر بات ہوگی۔

۲:۱۱:۱(۷) [فِیْ طُغْیَانِھِمْ] جو فی (میں) + طغیان (جس کے معنی ابھی بیان ہوں گے) + ھم (ان کی) کا مرکب ہے۔ اس میں لفظ " طُغْیان " کا مادہ " ط غ ی " اور وزن " فُعْلان " ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد طغَی یَطْغٰی (باب فتح سے) اور طَغِیَ یَطْغٰی طغیاناً (باب سمع سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی " حد سے بڑھنا یا بڑھ جانا " ہیں یعنی یہ فعل لازم ہے۔ بلکہ مادہ " ط غ و "

(واوی) سے بھی فعل مجرد طغا یطغو (باب نصر سے) ان ہی معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس فعل (ثلاثی مجرد) کے ماضی اور مضارع کے مختلف مستعمل صیغوں (جو بارہ ۱۲ کے قریب مقامات پر آئے ہیں) پر غور کرنے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں یہ فعل تو ہمیشہ یائی اللام اور باب فتح سے ہی استعمال ہوا ہے۔ البتہ ایک دو ماخوذ اسماء (مثلاً طغوی یا طاغوت) واوی اللام ہیں۔

اس مادہ سے مزید فیہ کے صرف باب افعال کا ایک ہی صیغہ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے (ق: ۲۷) یہ مزید فیہ فعل اور ثلاثی مجرد سے کچھ اسمائے مشتقہ (مثلاً طاغون یا طاغین اور الطاغیۃ) واوی یائی دونوں مادوں سے مشتق قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ "طُغیان" جو ثلاثی مجرد کا ایک مصدر ہے، قرآن کریم میں یہ مفرد یا مرکب شکل میں ۹ مرتبہ وارد ہوا ہے۔ اس مادہ کے فعل ثلاثی مجرد کے (مذکورہ بالا) بنیادی معنوں کی بناء پر اس (طغیان) کا ترجمہ "سرکشی" ہی کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ "شرارت" بھی کیا ہے، جسے "منطقی" ترجمہ کہا جاسکتا ہے یعنی جو عموماً "سرکشی" کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔

۲:۱۱:۱ (۸) [يَعْمَهُوْنَ] کا مادہ "ع م ھ" اور وزن "یَفْعَلُوْنَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "عَمِهَ یَعْمَهُ عَمَهًا" (باب سمع اور فتح سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں "کوئی راستہ یا جواب نہ سوجھنے پر حیران ہو کر کبھی آگے کبھی پیچھے جانا"، "متردد اور متحیر ہونا" ــــ اور اسی سے اس کا نسبتاً آسان ترجمہ "حیران و سرگرداں ہونا، ٹامک ٹوئیے مارنا، بہکتے پھرنا اور بھٹکتے رہنا" کیا گیا ہے۔ اور بعض نے مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ "عقل کا اندھا ہونا" بھی کیا ہے۔ کیونکہ جس طرح مادہ "ع م ی" (جس کا استعمال ابھی آگے آیت: ۱۸ [۲:۱۳:۱ (۱۴)] میں آرہا ہے) کے بنیادی معنی "بصارت کا اندھا ہونا" ہیں۔ اسی طرح اس مادہ (ع م ھ) کے بنیادی معنی "بصیرت کا اندھا ہونا" ہیں۔

اس مادہ سے قرآن کریم میں صرف اسی فعل (عَمِہ) سے مضارع معروف جمع مذکر غائب کا (یہی) صیغہ " یعمھون " کل سات مرتبہ وارد ہوا ہے۔ اس سے کوئی اور اسم یا فعل قرآن کریم میں نہیں آیا۔ " یعمھون " کا ترجمہ مندرجہ بالا معانی کی روشنی میں عموماً فعل حال سے کیا گیا ہے مثلاً : " بہکتے ہیں، حیران و سرگردان ہو رہے ہیں، بہک رہے ہیں۔ بعض حضرات نے فعل مضارع کے ساتھ بھی ترجمہ کیا ہے یعنی " پڑے ٹامک ٹوئیے مارا کریں ، بھٹکتے رہیں، بہکے پھریں "۔ بعض نے فعل کا ترجمہ جملہ اسمیہ کی طرح " عقل کے اندھے ہیں " کی صورت میں کیا ہے جو مفہوم کے اعتبار سے درست مگر لفظ سے ذرا ہٹ کر ہے۔

۲ : ۱۱ : ۲ الإعراب

واذا لقوا الذین آمنوا قالوا آمنا۔ واذا خلوا الی شیطینھم قالوا انا معکم۔ انما نحن مستھزءون ۝ اللہ یستھزئ بھم۔ ویمدھم فی طغیانھم یعمھون۔

اس قطعہ میں دو آیات ہیں جو بلحاظ ترکیب نحوی پانچ چھوٹے جملوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی آیت میں تین جملے ہیں جن میں سے پہلے دو شرطیہ جملے ہیں اور تیسرا جملہ گو بلحاظ ترکیب مستقل جملہ ہے مگر ترکیب میں اسے دوسرے جملہ شرطیہ کا حصہ ہی سمجھنے کی گنجائش موجود ہے۔ دوسری آیت دو فعلیہ جملوں پر مشتمل ہے جو واو عاطفہ کے ذریعے ملائے گئے ہیں۔ عام متعارف " رموزِ اوقاف " استعمال کرنے کی بجائے ہم نے نحوی لحاظ سے مستقل جملوں کے درمیان علامت وقفہ (۔) ڈال دی ہے۔ اعراب کی تفصیل یوں ہے۔

● [وَ] عاطفہ بھی ہو سکتی ہے یعنی جملے کا عطف سابقہ جملے (واذا قیل..... لا یعلمون) پر بھی ہو سکتا ہے اور اسے واو الاستیناف بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ایک نئے جملے یا منافقین کی ایک اور خرابی کا بیان شروع ہوتا ہے۔

[اذا] شرطیہ ظرفیہ ہے یعنی اس میں شرط (جب بھی، جب کبھی بھی) اور ظرف یعنی وقت اور جگہ ("جس وقت بھی" ، اور "جس جگہ بھی") کا مفہوم موجود ہے۔
[لَقُوْا] فعل ماضی معروف صیغہ جمع مذکر غائب ہے جس میں ضمیر فاعلین "ھم" مستتر ہے جو منافقین کے لئے ہے جن کا ذکر آیت : ۸ [۲ : ۷] سے چل رہا ہے۔ یہاں بھی فعل ماضی کا ترجمہ " اذا شرطیہ " کی وجہ سے حال میں کیا جائے گا یعنی "جب وہ ملتے ہیں" [الذین] اسم موصول (جمع مذکر) یہاں فعل " لقوا " کا مفعول بہ ہو کر منصوب ہے جس میں مبنی ہونے کے باعث ظاہراً کوئی علامتِ نصب نہیں ہے۔ [آمَنُوا] فعل ماضی معروف مع ضمیر فاعلین (مستتر) " ھم " جملہ فعلیہ بن کر " الذین " کا " صلہ " ہے اور یہ صلہ موصول (الذین آمنوا) " واذا لقوا " کے ساتھ مل کر جملہ شرطیہ کا پہلا حصّہ یعنی بیانِ شرط بنتے ہیں۔
[قالوا] فعل ماضی معروف مع ضمیر فاعلین " ھم " جملہ فعلیہ ہے اور یہاں سے جوابِ شرط شروع ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ " تو کہتے ہیں " ہوگا۔ فعل ماضی ہونے کے باعث یہاں شرط اور جوابِ شرط کے فعل (لقوا۔ اور۔ قالوا) "جزم" سے بری ہیں۔ [آمنا] فعل ماضی معروف جمع متکلم مع ضمیر " نحن " ہے۔ اور فعل قالوا کا مفعول بہ ہو کر محلاً منصوب ہے۔ اس جملے " قالوا آمنا " کے ساتھ پہلا جملہ شرطیہ مکمل ہوتا ہے۔

● [وَ] یہاں عاطفہ ہے جو دو جملوں کو ملا رہی ہے [اذا] مثل سابق شرطیہ ظرفیہ ہے اور [خلَوْا] فعل ماضی معروف جمع مذکر غائب مع ضمیر فاعلین مستتر (ھم) ہے۔ اس کا ترجمہ بھی بوجہ شرط حال میں ہوگا " تنہا ہوتے ہیں "۔ اور اس کے بعد [اِلٰی شیاطینھم] میں حرف الجر " الی " فعل " خلَوْا " کا صلہ ہے۔ اور " شیاطینھم " مرکب اضافی (شیاطین مضاف + ھم ضمیر مجرور مضاف الیہ) مجرور بالجر (الی) ہے۔ یہاں تک یعنی " واذا خلَوْا الی شیاطینھم " کے ساتھ بیانِ شرط ختم ہوتا ہے۔ اس کے فوراً بعد [قالوا] جو فعل ماضی

ہے ، سے جواب شرط شروع ہوتا ہے اس لیے یہاں (شیاطینھم کے بعد) وقف جائز نہیں ہے اس لیے یہاں " لا " لکھا جاتا ہے ۔ اس کا ترجمہ بھی " تو کہتے ہیں " ہوگا ۔ [اِنَّا] " اِنَّ " حرف مشبہ بالفعل ہے اور اس میں " نَا " ضمیر منصوب متصل اس (اِنَّ) کا اسم (منصوب) ہے یعنی " اِنَّنا " سے ہی " اِنَّا " بنا ہے ۔ [مَعَکم] میں ظرف (مَعَ) اپنے مضاف الیہ (کُمْ) سمیت " اِنَّ " کی خبر (یا قائم مقام خبر) ہے ۔ اس کے بعد آگے " اِنَّما " سے شروع ہونے والا جملہ اگرچہ ترکیب نحوی کے لحاظ سے ایک مستقل جملہ ہے مگر " اِنَّا معکم " اور اس کے بعد والا جملہ (جو " انما " سے شروع ہوتا ہے) دونوں کا تعلق " قالوا " سے ہے یعنی یہ دونوں ہی منافقین کے قول ہیں اس لیے یہاں بھی (مَعَکم کے بعد) وقف جائز نہیں سمجھا گیا جسے اوپر باریک " لا " لکھ کر ظاہر کیا جاتا ہے ۔

● [اِنَّما] میں " مَا " کافہ اور " اِنَّ " مکفوفہ ہے ۔ یہ " مَا " اِنَّ کا عمل (بطور حرف مشبہ بالفعل) روک دیتا ہے ۔ اور حصر و تاکید کے معنی دیتا ہے ۔ اس (انما) کا ترجمہ " بات صرف یہ ہے کہ " یا " حقیقت صرف یہ ہے کہ " ہونا چاہیئے مگر اردو محاورے میں یہاں صرف " بیشک " سے ترجمہ کیا جاتا ہے (اِنَّ کی طرح) ۔ [نَحْنُ] ضمیر مرفوع منفصل مبتدأ ہے یعنی " ہم " ۔ " انما " کے ساتھ مل کر " انما نحن " کا ترجمہ " ہم تو محض " سے کیا گیا ہے جس میں " انما " کے حصر والا مفہوم آجاتا ہے [مُستھزءون] نحن (مبتدأ) کی خبر (لہذا) مرفوع ہے اور یہ دوسرا جملہ اسمیہ " انما نحن مستھزءون " پہلے جملہ (اِنَّا مَعَکم) کی تاکید ہے اور یہ دونوں جملے مل کر فعل " قالوا " کا مقولہ ہونے کے باعث محلاً منصوب سمجھے جا سکتے ہیں ۔ اور دونوں " مقول " جملے جواب شرط ہونے کی حیثیت سے ایک ہی جملہ (بلحاظ مفہوم) شمار ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ دوسرا جملہ شرطیہ مکمل ہوتا ہے اس لیے ان کے درمیان وقف جائز نہیں ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے ۔ اور ان دونوں شرطیہ جملوں میں فعل ماضی کے تمام صیغوں کا ترجمہ فعل حال سے کیا جائے گا

کیونکہ شرط زمانۂ ماضی کے لیے نہیں ہوتی۔

یہاں آیت کے آخر پر (مستھزءون کے بعد) لازماً وقف کرنا چاہیئے ورنہ اس سے اگلی آیت (اللہ یستھزئ بھم .....) بھی پچھلی آیت میں بیان کردہ قولِ منافقین کا ایک جزء بننے کا احتمال پیدا ہوتا ہے۔

● [اَللّٰہُ] مبتدأ (لہذا) مرفوع ہے۔ اور [یستھزئُ] فعل مضارع معروف مع ضمیر فاعل (ھو) پورا جملہ (فعلیہ) بن کر خبر ہے۔ جسے محلاً مرفوع کہہ سکتے ہیں۔ [بھم] جارّ (بِ) اور مجرور (ھم) مل کر فعل "یستھزئ" کے متعلق ہیں۔ بلکہ حرف الجر (بِ) فعل "یستھزئ" کا صلہ ہونے کے باعث "بِھِمْ" یہاں مفعول ہو کر موضع نصب میں ہے۔ مبتدأ خبر مل کر ایک جملہ اسمیہ مکمل ہوا۔ خیال رہے اللہ کی طرف "استھزاء" کی نسبت بطور مشاکلت ہے اور اس کا مطلب ہے "وہ ان کو اس استہزاء کی ویسی ہی سزا دے گا"۔ اس کے بعد

● [وَ] عاطفہ ہے جو بعد میں آنے والے فعل (یمدُّ) کو سابقہ فعل (یستھزئ) پر عطف کرتی ہے یا پہلے جملہ (اللہ یستھزئ بھم) کو ("وَ" کے) بعد والے جملے سے ملاتی ہے۔ [یَمُدُّھُم] میں "یمدُّ" تو فعل مضارع معروف مع ضمیر فاعل مستتر "ھو" ہے جو "اللہ" کے لیے ہے۔ اور "ھم" ضمیر متصل یہاں (فعل یمدّ کا) مفعول بہ منصوب ہے۔ یعنی "وہ ڈھیل دیتا ہے ان کو"۔ اور ضمیر "ھم" (ان) کا مرجع منافقین ہیں۔

[فی طغیانھم] میں "فِی" حرف الجر ہے اور "طغیانھم" مرکب اضافی ہے جس میں لفظ "طغیان" تو بوجہ "جر" مجرور ہے۔ علامتِ جر "ن" کا کسرہ (ـِـ) ہے اور یہ آگے مضاف ہونے کے باعث خفیف (لام تعریف اور تنوین سے بری) ہے۔ اور ضمیر "ھم" مضاف الیہ ہو کر مجرور (بالاضافہ) ہے۔ اور [یعمھون] فعل مضارع جمع مذکر غائب مع ضمیر فاعلین مستتر "ھم" جملہ فعلیہ ہے۔ یعنی "وہ بھٹکتے پھرتے ہیں"۔ اور یہ (یعمھون) "یمدّھم" کی ضمیر

مفعول (ھم) کا حال ہوکر محلاً منصوب ہے یعنی " ان کو ڈھیل دیتا ہے اس حالت میں کہ وہ بھٹکتے پھرتے ہیں "

مرکب جاری " فی طغیانھم " کو موقع کے لحاظ سے (۱) فعل "یمدھم" سے متعلق بھی قرار دے سکتے ہیں یعنی " یمدھم فی طغیانھم " اور اگر چاہیں تو (۲) اس (فی طغیانھم) کو " یعمھون " (حال) سے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں یعنی " یعمھون فی طغیانھم " پہلی صورت میں اس عبارت (یمدھم فی طغیانھم + یعمھون) کا ترجمہ ہوگا (۱) "وہ ڈھیل دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں درانحالیکہ (اور حالت یہ ہے کہ) وہ حیران و سرگردان ہو رہے ہیں"۔ اور دوسری صورت میں ترجمہ ہوگا (۲) " وہ ڈھیل دیتا ہے ان کو اس حالت میں کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگردان ہیں "۔ اردو کے بیشتر مترجمین نے دوسری ترکیب کے مطابق ترجمہ کیا ہے البتہ بعض مترجمین نے (غالباً) اردو محاورے کا خیال کرتے ہوئے عربی کے " حال " کا ترجمہ " درانحالیکہ " یا " اس حالت میں کہ " یا " حالت یہ ہے کہ " کی صورت میں کرنے کی بجائے صرف " کہ " سے کر لیا ہے یعنی ـــ " کہ اپنی سرکشی میں ٹامک ٹوئیے ماریں " یا " کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں "۔ تاہم یہ کہ " یہاں بمعنیٔ " تاکہ " استعمال ہوا ہے حالانکہ یہاں عربی عبارت میں کوئی " لام کی " یا " لام صیرورت " (جس کا ترجمہ " نتیجہ یہ کہ " ہوتا ہے) نہیں ہے ـــ اسی طرح بعض نے اس (فی طغیانھم یعمھون) کا ترجمہ " شرارت میں بھٹکتے ہوئے " کیا ہے۔ اس میں ایک تو ضمیر " ھم " کا ترجمہ (اپنی) چھوٹ گیا ہے دوسرے (فعل) " یعمھون " کا ترجمہ (اسم) " عامھین " کی صورت میں کیا گیا ہے جو اگرچہ لفظ سے ذرا ہٹ کر ہے تاہم دونوں (یعمھون اور عامھین) کے حال واقع ہونے کی وجہ سے درست ہے۔

۲:۱۱:۳ الرسم

ان دو آیات میں سے بلحاظ رسم عثمانی صرف حسب ذیل کلمات تفصیل طلب

ہیں :

لقوا[۱] ، امنوا[۲] ، قالوا[۳] ، خلوا[۴] ـ شیاطینھم[۵] ـ مستھزءون[۶] اور طغیانھم[۷] ـ

(۱) ان میں سے پہلے چار کلمات فعل ماضی کے صیغہ ہائے جمع مذکر غائب ہیں۔ ان میں واو الجمع آتی ہے اور اس واو الجمع کے بعد ایک زائد الف لکھا جاتا ہے۔ ویسے یہ (واو الجمع کے بعد الف زائدہ لکھنا) رسم املائی اور رسم عثمانی دونوں کا قاعدہ ہے۔ ہم نے یہاں اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ قرآنی رسم میں بعض جگہ واو الجمع کے بعد یہ زائد الف نہیں لکھا جاتا۔ ان کا ذکر اپنے موقع پر ہوگا۔ انشاءاللہ تعالےٰ۔

(۲) " شَیٰطِیْنِهِمْ " میں کلمہ " شیٰطِین" رسم قرآنی (عثمانی) میں بالاتفاق اسی طرح بحذف الف (بین الیاء والطاء) لکھا جاتا ہے اور " ھم " کو ہمیشہ آخری " ن " کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے۔ ترکی و ایران اور برصغیر کے بعض مصاحف میں اس کو عام عربی املاء کے مطابق بصورت " شیاطینھم " لکھنا رسم عثمانی کی صریح خلاف ورزی ہے۔

(۳) " مستھزءون " میں " ز " اور " و " کے درمیان والا ہمزہ (ء) اصل رسم عثمانی (عثمانی مصاحف) میں نہیں لکھا گیا تھا۔ اس لیے اب اسے ہمزۂ قطع کے لیے مقرر کردہ کسی علامت قطع (ء ، ۶ ، ۶ ، ع وغیرہ) سے ظاہر کرتے ہیں۔ اور اسی لیے اس ہمزہ کو عام قواعد کے مطابق[۱] " ی " یا " و " کی کرسی پر (ئو یا ؤ) نہیں لکھتے (یعنی بصورت مستھزئون یا مستھزؤون)۔ کیونکہ اس طرح لکھنے سے اصل رسم عثمانی پر ایک حرف (یعنی " ی " بصورت نبرہ (دندانہ) یا " و ") کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہمزہ کو ظاہر کرنے والی علامت قلمی دور میں اسی لیے سرخ سیاہی سے لکھی جاتی تھی۔ دورِ طباعت میں اس کے لیے 'علاماتِ

---

[۱] اس قسم کے ہمزہ کی عام املائی کتابت کے قاعدہ کے لیے دیکھئے " نخبۃ الاملاء " (عبدالفتاح خلیفہ) ص ۱۴

ضبط کی طرح، ایک الگ مستقل علامت (ء، ی، ٸ، E وغیرہ) اختیار کی جاتی ہے اسے اصل ہجا (SPELLING) پر اضافہ نہیں کہہ سکتے —— اور اس ہمزہ (بین الزای والواو) کو کتابتِ عثمانی میں ساقط کرنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ بعض قراءتوں میں اسے "مستھزِیُون"، اور بعض میں "مستھزُون" بھی پڑھا گیا ہے[۱]۔ اس طرح اس لفظ کا رسم عثمانی دونوں قراءتوں کا محتمل ہے۔

(۴) "طغیانِھم" میں لفظ "طغیان" (جو ضمیر "ھم" کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے) کے رسم (عثمانی) کے بارے میں الف (بین الیاء والنون) کے حذف و اثبات میں اختلاف ہے۔ صرف ابوداؤد (سلیمان بن نجاح) کے حوالے سے (ان کی اصل کتاب "التنزیل" اب تک طبع نہیں ہوئی۔ بعد کے مصنفین ان کے حوالے سے بات کرتے ہیں)۔ اس (الف) کے محذوف ہونے کا ذکر کیا گیا ہے یعنی یہ "طُغۡیٰنِہِمۡ" کی صورت میں لکھا جانا چاہیے۔ چنانچہ مصری، شامی، سعودی اور بیشتر افریقی مصاحف میں اسی بناء پر یہ اسی طرح محذوف الالف لکھا گیا ہے۔

● دوسری طرف نثر المرجان (ارکاٹی)، دلیل الحیران (المارغنی) اور لطائف البیان (ابوزیتحار) میں تصریح کی گئی ہے کہ الدانی (عثمان بن سعید) کے نزدیک یہ عام قاعدہ ہے کہ "فُعۡلان" کے وزن پر آنے والے تمام کلمات اثبات الف کے ساتھ لکھے جاتے ہیں[۲] الّا یہ کہ اس کے خلاف تصریح موجود ہو اور یہ تصریح اس لفظ (طغیان) کے بارے میں کم از کم "الدانی" نے تو نہیں کی ہے۔ بلکہ صاحبِ نثر المرجان نے "خلاصۃ الرسوم" اور "خزانۃ الرسوم" کے حوالے سے بھی یہاں الف کا اثبات بیان کیا ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مشرقی ممالک (ترکی، ایران، برصغیر وغیرہ) کے مصاحف میں اسے عام عربی املاء کے مطابق "طغیانھم"

---

[۱] اتحاف فضلاء البشر (للبناء) ج ۱ ص ۲۷۹۔ نیز کتاب الاشارات (عبداللہ بابڑزئی) ص ۱۔

[۲] دلیل الحیران ص ۸۰، لطائف البیان ج ۱ ص ۲۹ اور نثر المرجان ج ۱ ص ۱۱۱۔

ہی لکھا جاتا ہے۔ اور اسی بناء پر لیبی مصحف میں " طغیانہم " (باثبات الف) لکھا گیا ہے کیونکہ بصورت اختلاف اہلِ لیبیا " الدانی " کے قول کو ابوداؤد کے قول پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب کہ مصری، شامی، سعودی اور بیشتر افریقی ممالک میں بصورت اختلاف الدانی کی بجائے ابوداؤد کے قول کو راجح سمجھا جاتا ہے لہٰذا وہاں کے مصاحف میں یہ لفظ بحذف الف " طغینہم " لکھا جاتا ہے۔

۲:۱۱:۴ الضبط

قطعہ زیر مطالعہ کے کلمات میں متفقہ یا مختلف فیہ ضبط کو درج ذیل مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ خصوصاً " مستہزءون " اور " یستہزئ " میں ہمزہ کی پوزیشن اور اس کا طریق ضبط قابلِ غور ہے۔ اس کے بارے میں ہم نے آخر پر " نوٹ " میں کچھ وضاحت کر دی ہے۔

وَ / اِذَا ، اِذٰا ، اِذَا ، ءِاذَا / لَقُوا ، لَقُوْا ، لَقُوْا

الَّذِيْنَ ، الَّذِيْنَ ، اَلَّذِيْنَ ، اَلَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا ، اٰمَنُوا ، ءَامَنُوْا ، ءَامَنُوْا

قَالُوْا ، قَالُوا ، قَالُوْا ، قَالُوْا

اٰمَنَّا ، اٰمَنَّا ، ءَامَنَّا ، ءَامَنَّا / وَ اِذَا (مثل سابق)

خَلَوْا ، خَلَوْا ، خَلَوْا / اِلٰی ، اِلٰی ، ءِلٰی

شَیٰطِیْنِهِمْ ، شَیٰطِیْنِهِمْ ، شَیٰطِیْنِهِمْ

قَالُوْا (مثل سابق) / اِنَّا ، اِنَّا ، اِنَّا ، ءِنَّا

مَعَكُمْ (یکساں) / اِنَّمَا ، اِنَّمَا ، اِنَّمَا ، اِنَّمَا

نَحْنُ ، نَحْنُ / مُسْتَهْزِءُوْنَ ،

مُسْتَهْزِؤُنَ ، مُسْتَهْزِءُوْنَ ، مُسْتَهْزِوْنَ

اَللّٰهُ ، اَللّٰهُ ، اَللّٰهُ ، اَللّٰهُ

يَسْتَهْزِئُ ، يَسْتَهْزِئُ ، يَسْتَهْزِئُ

بِهِمْ (یکساں) / وَيَمُدُّهُمْ (یکساں)

فِيْ ، فِيْ ، فِيْ ، فِيْ

طُغْيَانِهِمْ ، طُغْيَانِهِمْ ، طُغْيَانِهِمْ (بحذف الف)

يَعْمَهُوْنَ ، يَعْمَهُوْنَ ، يَعْمَهُوْنَ

نوٹ : ایران اور ترکی میں " مستھزؤن " کا ہمزہ " واو " کے اوپر لکھتے ہیں اور ترکی کے مصاحف میں اس " ؤ " کے نیچے باریک سا لفظ " مد " لکھ دیتے ہیں تاکہ قاری اسے صرف (ـُـ) سے نہ پڑھے بعض مصاحف میں اسے ضمہ معکوس (ـُـ) سے لکھتے ہیں " ؤ " کی صورت میں ۔ افریقی مصاحف میں " یستھزئ " میں ہمزہ کو " ی " کے دائیں کنارے پر لکھتے ہیں اور یہ اس لیے بہتر ہے کہ افریقی اور عرب ممالک میں یاء ماقبل مکسور کو علامت سکون سے خالی رکھا جاتا ہے ۔ یعنی " فِيْ " کو صرف " فِي " لکھتے ہیں ۔ اس طرح ان کا قاری اس لفظ کو پہلی نظر میں " فِیْ " پڑھ سکتا ہے ۔ اگر ہمزہ " ئ " کے پہلے سرے پر ہوگا تو وہ یہ غلطی نہیں کرے گا ۔ اس لحاظ سے عرب ملکوں کا ضبط ناقص ہے ۔ برصغیر میں تمام علامات سے خالی " ی " کو پڑھا ہی نہیں جاتا اس لیے یہ التباس پیدا نہیں ہوگا ۔

۱۔ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، ج ۱ ص ۳۵

۲۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۳ ص ۳۲۹

۳۔ عبدالحی بن العماد الحنبلی، شذرات الذہب، ج ۳ ص ۳۰۴

ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۳ ص ۳۲۹

۴۔ ابنِ عساکر، تبیین کذب المفتری، ص ۲۶۲

ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب، ج ۳ ص ۳۰۵

۵۔ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، ج ۱ ص ۳۵

۶۔ ابنِ عساکر، تبیین کذب المفتری، ص ۲۶۶

۷۔ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، ج ۱ ص ۳۵

۸۔ نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلاء، ص ۱۹۰

۹۔ ابن سبکی، طبقات الشافعیہ، ج ۳ ص ۴

۱۰۔ ابنِ عساکر، تبیین کذب المفتری، ص ۲۶۷

۱۱۔ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، ج ۱ ص ۳۵

ابنِ جوزی، المنتظم، ج ۸ ص ۲۸۲

ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۳ ص ۳۳۰

۱۲۔ ابنِ کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۱۲ ص ۱۴

۱۳۔ ابنِ صلاح، مقدمہ ابنِ صلاح، ص ۱۳

۱۴۔ ضیاءالدین اصلاحی، تذکرۃ المحدثین، ج ۲ ص ۲۵۵

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

رسیدِ کُتب

گذشتہ ماہ کے دوران ہمیں مسلم اکادمی (۲۹/۱۸، محمد نگر، لاہور) کی جانب سے درج ذیل دو کتب بغرضِ تبصرہ موصول ہوئیں۔ کتب کی رسید پیشِ خدمت ہے۔

(۱)

آسان ترجمۂ قرآن

(پارہ الٓمٓ)

پہلی سطر میں ہر لفظ کا جُدا جُدا ترجمہ، دوسری سطر میں سلیس ترجمہ

مرتّب : حافظ نذر احمد

ملنے کا پتہ : اُردو بازار میں یہ کتاب حسب ذیل مراکز سے دستیاب ہے۔
اسلامی اکادمی، مکتبہ رحمانیہ، مکتبہ تعمیرِ انسانیت اور اسلامی کتب خانہ

(۲)

آسان عربی قواعد

مرتّبہ : صفیہ ناہید احمد

ملنے کے پتے :

مسلم اکیڈمی، ۲۹/۱۸، محمد نگر، لاہور ۵، اور
چوہدری حمید اللہ چوہان، ۴۔ مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

۱۔ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، ج ۱ ص ۳۵

۲۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۳ ص ۳۲۹

۳۔ عبدالحی بن العماد الحنبلی، شذرات الذہب، ج ۳ ص ۳۰۴

ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۳ ص ۳۲۹

۴۔ ابنِ عساکر، تبیین کذب المفتری، ص ۲۶۲

ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب، ج ۳ ص ۳۰۵

۵۔ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، ج ۱ ص ۳۵

۶۔ ابنِ عساکر، تبیین کذب المفتری، ص ۲۶۶

۷۔ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، ج ۱ ص ۳۵

۸۔ نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلاء، ص ۱۹۰

۹۔ ابن سبکی، طبقات الشافعیہ، ج ۳ ص ۴

۱۰۔ ابنِ عساکر، تبیین کذب المفتری، ص ۲۶۷

۱۱۔ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، ج ۱ ص ۳۵

ابنِ جوزی، المنتظم، ج ۸ ص ۲۸۲

ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۳ ص ۳۳۰

۱۲۔ ابنِ کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۱۲ ص ۱۴

۱۳۔ ابنِ صلاح، مقدمہ ابنِ صلاح، ص ۱۳

۱۴۔ ضیاء الدین اصلاحی، تذکرۃ المحدثین، ج ۲ ص ۲۵۵

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

رسیدِ کُتب

گذشتہ ماہ کے دوران ہمیں مسلم اکادمی (۱۸/۲۹، محمد نگر، لاہور) کی جانب سے درج ذیل دو کتب بغرضِ تبصرہ موصول ہوئیں۔ کتب کی رسید پیشِ خدمت ہے۔

(۱)

آسان ترجمۂ قرآن

(پارہ الٓمٓ)

پہلی سطر میں ہر لفظ کا جُدا جُدا ترجمہ، دوسری سطر میں سلیس ترجمہ

مرتّب : حافظ نذر احمد

ملنے کا پتہ : اُردو بازار میں یہ کتاب حسب ذیل مراکز سے دستیاب ہے۔
اسلامی اکادمی، مکتبہ رحمانیہ، مکتبہ تعمیرِ انسانیت اور اسلامی کتب خانہ

(۲)

آسان عربی قواعد

مرتّبہ : صفیہ ناہید احمد

ملنے کے پتے :

مسلم اکیڈمی، ۱۸/۲۹، محمد نگر، لاہور ۵، اور
چوہدری حمید اللہ چوہان، ۴۔ مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

بقیہ : 'ہمارے تعلق بالقرآن کے چند غور طلب گوشے'

تنزیلاتِ ربانی ہو سکتے ہیں اور اس طرح یُؤمِنُونَ بِمَا اُنزِلَ اِلَیکَ وَمَا اُنزِلَ مِن قَبلِکَ کا حق صحیح طور پر ادا ہو سکے۔

تبلیغ و تبیان کا مہتم بالشان کام قرآن اکیڈمی نے بڑی مستعدی سے شروع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی سعی سے بلاشبہ تعلیماتِ قرآنی کا ڈنکا بجا اور اس کی شہرت دُور دور گئی۔ اس عظیم کام میں مشکلات بہت ہیں لیکن جس عزیمت سے یہ کام ہو رہا ہے اس میں اقبال کی یہ بانگ رحیلِ کارواں ہے کہ ؎

منزلِ عشق بسے دُور دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے!

منہجِ انقلابِ نبویؐ

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے رہنما خطوط

اسلامی انقلاب کے مراحل مدارج اور لوازم

پر مشتمل

ماہنامہ "میثاق" میں شائع شدہ

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے گیارہ خطبات کا مجموعہ

اشاعتِ عام
قیمت: -/۳۰ روپے

اشاعت خاص
قیمت: -/۶۰ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶ ماڈل ٹاؤن لاہور

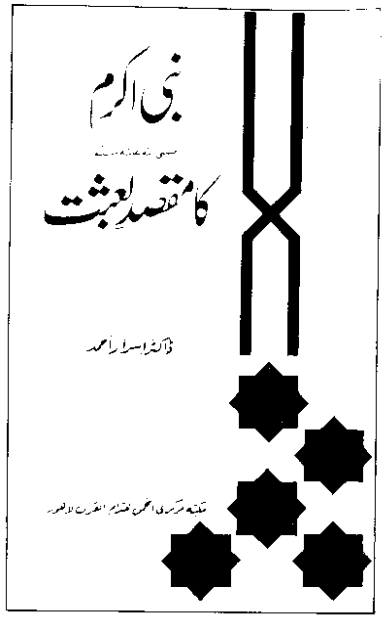

اشاعتِ خاص -/۲۰ روپے، عام -/۶ روپے

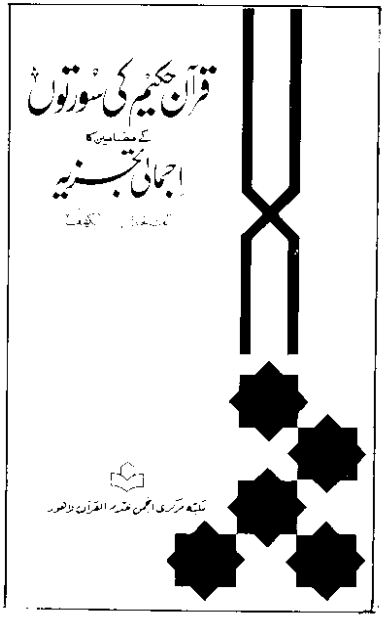

اشاعتِ خاص -/۴۰ روپے، عام -/۲۰ روپے

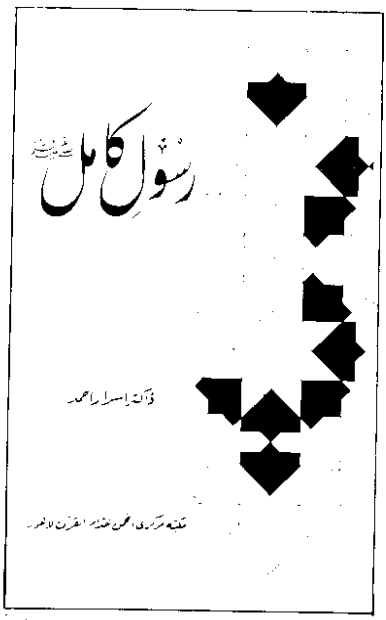

اشاعتِ خاص -/۱۲ روپے، عام -/۵ روپے

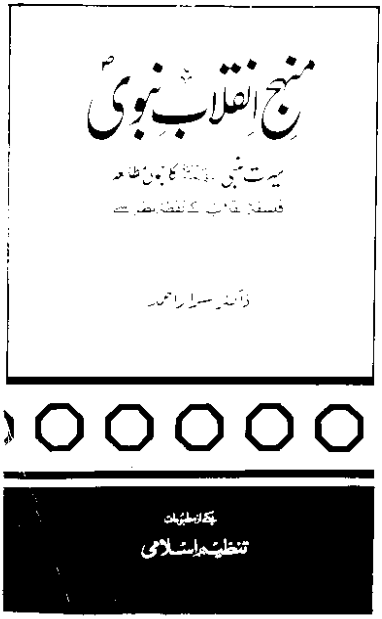

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

SEPTEMBER 1990 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 9
NO. 9

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ